میں تھا کہ آپ کے اور جولین کے درمیان آخری دیوار گرانے کے لیے میرا یہاں ٹھہرنا ضروری ہے، بہر حال مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میری خدمات کی ضرورت نہیں پڑی، انور علی نے کہا کہ لیکن آپ تو یہ کہتے تھے کہ آپ صرف جین کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ کرنے کے لیے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جین نے سرنگاپٹم کے ایک مغرور نوجوان کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر نے میں کہاں تک عقل مندی سے کام لیا ہے آپ کو یہ خیال کیسے ہوا کہ میں مغرور ہوں، جین کے ساتھ چند باتیں کرنے کے بعد میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ آپ کے درمیان جو چیز اب تک حائل رہی ہے وہ صرف آپ کا غرور ہے، کیا آپ کے نزدیک میرے لیے یہ بات کافی نہیں تھی کہ وہ میرے دوست کی بیوی تھی، موسیو جین کو صرف آپ کے غرور نے لیگرانڈ کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو مغرور کہنے سے میرا مقصد آپ کی توہین ہے، میں آپ کو ایک بلند ترین انسان سمجھتا ہوں، مجھے آپ کے ایثار و خلوص اور آپ کی نیکی اور شرافت کا اعتراف ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر آپ کی نگاہوں کے سامنے غرور کے پردے حائل نہ ہوتے تو آپ کو یہ جاننے میں اتنی دیر نہ لگتی کہ وہ بے بس لڑکی جسے آپ نے پہلی بار پانڈی چری کی بندرگاہ پر دیکھا تھا وہ آپ کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا چکی ہے۔ موسیو پانڈی چری میں میں نے جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ میرے دوست کی بیوی تھی۔ اور اگر میرے سامنے کوئی چیز حا ئل تھی تو وہ میرا غرور نہیں بلکہ ایک شریف آدمی کی حیا اور اخلاق تھا، اور میں جین کے متعلق یہ سننا پسند نہیں کروں گا کہ وہ ایک وفا شعار بیوی نہیں تھی، میں نے یہ نہیں کہا کہ جین وفا شعار نہیں تھی، اگر وہ میری بہن ہوتی تو بھی میرے دل میں اس کے

لیے اس سے زیادہ عزت نہ ہوتی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو لیگرانڈ کی بے بسی پر رحم آیا اور آپ نے اس سے منہ پھیر لیا، اسی طرح جین کو اس پر رحم آیا، اور اس نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ لیگرانڈ میرا عزیز تھا اور میں اس مروت اور رحم دلی کے لیے آپ دونوں کا شکرگزار ہوں، لیکن جب میں آپ کے اور جین کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ لیگرانڈ آپ سے اتنی بڑی قربانی لینے کا حقدار نہ تھا۔ لیکن اب اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں، میں صرف آپ کو یہ سمجھانے کے لیے آیا تھا کہ اب جین بیوہ ہو چکی ہے، اور اسے آپ کی ضرورت ہے، مجھے اس نے پہلے یہ بات نہیں بتائی کہ وہ آپ کے لیے اپنا مذہب بھی تبدیل کر چکی ہے، ورنہ میں یہاں آپ کا انتظار کرنے کہ بجائے آپ کے لیے ایک خط لکھ کر چھوڑ جاتا، اب اگر آپ اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں کہ آپ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے تو سرنگا پٹم میں میرا کام ختم ہو جاتا ہے، میں اسی ہفتے واپس چلا جاؤں گا، اب آپ کو میرے ایک سوال کا جواب دینا ہے اور وہ یہ کہ آپ کی شادی کب ہو رہی ہے، انور علی کچھ دیر خاموشی سے جولین کی طرف دیکھتا رہا، بالآخر اس نے کہا کہ میں اس وقت اس سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتا، مجھے اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کرنا پڑے گا، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ عرصہ اور یہاں ٹھہر جائیں، نہیں اگر یہ ضروری ہوتا تو میں ضرور ٹھہرتا لیکن اب مجھے جانا چاہیئے، تو پھر آج سے آپ ہمارے مہمان ہیں، میں ابھی شاہی مہمان خانے سے آپ کا سامان منگوا لیتا ہوں، مجھے منظور ہے، انور علی نے کہا موسیو جولین آپ بہت ذہین آدمی ہیں، لیکن میں ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں، ــــــــــــ ابتدا میں اگر مجھے جین کے ساتھ کوئی دلچسپی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لیگرانڈ میرا دوست تھا اور لیگرانڈ کی زندگی میں جین کے ساتھ

میرا رشتہ ایسا تھا جس پر بہن اور بھائی دونوں فخر کر سکتے ہیں، میں جب ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر لیگر انڈ زندہ ہو جائے اور میں انہی حالات میں ایک بار پھر جین کے ساتھ پانڈی چری کی بندرگاہ سے سرنگا پٹم تک کا سفر کروں، تو میرے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، جولین نے کہا کہ میرے دوست تم کو یہ باتیں کہنے کہ ضرورت نہیں، مین یہ تسلیم کرتا ہوں کہ تم عام انسانون سے مختلف ہو، مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں یہاں پیدا نہیں ہوا، ورنہ آپ لوگوں کے ساتھ جینا مرنا میں اپنے لیے ایک سعادت سمجھتا۔ منور خان کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا، جناب چند آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں، اچھا میں آتا ہوں، دیکھو جین نے اگر ناشتہ کر لیا ہو تو اسے اوپر بھیج دو، منور خان نے جواب دیا کہ جناب وہ نیچے محلے کی چند عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہیں، انور علی نے جولین کی طرف متوجہ ہو کر فرانسیسی زبان میں کہا، مجھے ملنے کے لیے چند لوگ آئے ہیں، جین نیچے پڑوس کی عورتوں کے ساتھ مصروف ہے، آپ اطمینان سے بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں، جولین نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ آج سارا دن مصروف رہیں گے، اس لیے مجھے اجازت دیجیے، میں شام تک واپس آجاؤں گا۔ ویسے بھی آپ کے ہاں منتقل ہونے سے پہلے میرے لیے شاہی مہمان خانے کے ناظم سے اجازت لینا ضروری ہے، بہت اچھا لیکن شام کے وقت آپ ضرور آجایئے گا میں نوکر کو آپ کا سامان لینے کے لیے بھیج دوں گا، جولین اٹھ کر انور علی کے ساتھ چل دیا، مکان کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچ کر انور علی نے جولین کو رخصت کیا، اور دیوان خانے میں چلا گیا، باقی سارا دن اس کے یہاں پڑوسیوں اور دوستوں کا تانتا بندھا رہا، اور اسے منیرہ کے ساتھ کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملا، رات کے وقت اس نے دیوان خانے کے ایک

کمرے میں جولین کے ساتھ کھانا کھایا، اور کچھ دیر اس کے اتھ باتیں کرتا رہا، دس بجے کے قریب وہ اپنے مہمان سے رخصت لے کر دیوان خانے سے باہر نکلا، تو رہا ئیشی مکان کے دوازے پر منور خان کھڑا تھا، انور علی نے کہا کون منور تم یہاں کیوں کھڑے ہو، جناب میں آپ کا انتظار کر رہا تھا انور علی نے پیار کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، جاؤ آرام کرو، منور خان نے کہا جناب میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں، کہو لیکن مجھے ڈر ہے کہ بی بی جی خفا ہوں گی، اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں خاموش رہنا چاہیئے، لیکن جناب میں یہ سمجھتا ہوں کہ گھر کی کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں رہنی چاہیئے، میں کوئی بات نہیں کہنا چاہتا، ---------

----بات یہ ہے کہ بی بی جی مسلمان ہو چکی ہیں، اور ان کا نام اب جین نہیں بلکہ منیرہ ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے انہین کئی بار نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، انور علی نے کہا کہ منور تم نے بہت اچھی خبر سنائی ہے اور صبح میں تمہیں انعام دونگا، منور خان نے کہا جناب میں آپ کو اور ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ ابھی بی بی جی یہاں کھڑی آپ کا رستہ دیکھ رہی تھیں، میں قریب سے گزرا تو وہ مجھے دیکھ کر واپس چلی گئیں،

صحن میں پہنچ کر انھوں نے مجھے آواز دی، اور کہا جب آپ آئیں تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ وہ کھانا کھاتے ہی سو گئیں تھیں، میں اس سے پہلے بھی کئی بار انہیں آپ کا انتظار کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں، اچھا جاؤ اور اب سو جاؤ، انور علی یہ کہہ کر اندر داخل ہوا تھوڑی دیر کے بعد وہ جب اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہا تھا تو اسے اپنے بستر کے تکیے پر ایک کاغذ دکھائی دیا، اس نے کاغذ اٹھا کر کھولا اور کرسی گھسیٹ کر چرا غ دان کے قریب بیٹھ گیا، کاغذ پر اپنی ماں کے ہاتھ کی تحریر پہچان کر وہ اپنے دل میں

جذبات کا تلاطم محسوس کرنے لگا۔ انور علی کے نام فرحت کے ہاتھ کی آخری تحریر یہ تھی۔ نور چشم مجھے معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو، اور کس حال میں ہو، میں بیماری کی حالت میں تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں، اب میں شاید زیادہ دیر تمہارا، انتظار نہ کرسکوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ مرنے کے بعد میری روح کو یہ بے چینی نہیں رہے گی، کہ میرے بعد اس گھر میں تمہارے بھائی کے سوا تمہارا، انتظار کرنے والا کوئی نہیں، جب تم آؤ گے تو منیرہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی، اس کا ایک رشتہ دار اسے لینے کے آیا ہے، لیکن اس نے اپنے وطن جانے سے انکار کر دیا ہے۔ تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ اس انکار کی وجہ کیا ہے، منیرہ اسلام قبول کر چکی ہے اور میری خواہش ہے کہ تم اس کے ساتھ شادی کرلو، ایک ماں سے اپنے بچوں کی کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی، میں جانتی ہوں کہ تم دو نوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے، منیرہ اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو بھی شاید اس سے زیادہ میری خدمت نہ کرسکتی، مجھے یقین ہے کہ تم ضرور آؤ گے، تمہارے متعلق میں نے جو خواب دیکھے ہیں وہ تمام غلط نہیں ہو سکتے، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میں تمہیں نہیں دیکھ سکوں گی، لیکن میری روح ہمیشہ تمہاری مسرتوں میں تمہاری شریک رہے گی، تمہاری ماں،

انور علی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں، اس نے خط کو اپنے ہونٹوں سے لگایا، آنسو آنکھون سے چھلک کر خط میں جذب ہو چکے تھے، جولین انور علی کے ہاں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد رخصت ہوا اور اس کے جانے کے دس دن بعد مراد علی مدارس سے واپس آ گیا، مراد علی کے گھر پہنچتے ہی انور اور منیرہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، اور دو ہفتے کے بعد وہ رشتہ ءازدواج میں منسلک ہو گئے، دعوت ولیمہ میں شہر کے معززین نے، حکومت کے بڑے بڑے عہدے دار اور فوج کے

افسر شریک تھے، مہمانوں میں کئی افسر ایسے بھی تھے جو انور علی کے ساتھ مرہٹوں کی قید میں رہ چکے تھے، بدرالزمان خان جسے مرہٹوں نے سب سے آخر میں آزاد کیا تھا، شادی سے دو دن قبل سرنگا پٹم پہنچا تھا اور وہ علالت کے باوجود دعوت میں شریک تھا۔شادی کے کئی دن بعد تک شہر کے معزز گھرانوں کی بہو بیٹیاں مبارکباد کے لیے آتی رہیں اور دلہن کے لیے تحفے تحائف بھی لاتی رہیں، چنانچہ ایک دن منیرہ نے انور علی سے کہا کہ اب میرے پاس اتنے کپڑے جمع ہو گئے ہیں کہ آپ کو میرے لیے کئی سال تک نیا لباس بنوانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔اگر آپ کی اجازت ہو تو میں چند جوڑے پروس کی بیوہ اور محتاج عورتون میں تقسیم کردوں، انور علی نے جواب دیا، ایک نیک کام کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے تمام فالتو کپڑے شہر کی ان عورتوں میں تقسیم کردو جن کے شوہر جنگ میں شہید ہو چکے ہیں،

☆

شادی سے چند ہفتے کے بعد انور علی سرنگا پٹم میں ایک ہزار سواروں کی کمان سنبھال چکا تھا، اور مراد علی رسالہ دار کے عہدے پر ترقی کرکے چتل دڑگ روانہ ہو چکا تھا، جنگ کے اختتام سے اگلے سال لارڈ کارنوالس انگلستان واپس چلا گیا۔اور اس کی جگہ سرجان شور نے کمپنی کی زمام کار سنبھال لی۔لارڈ کارنوالس کی واپسی کے تقریباً چھ ماہ بعد انگریزون نے سلطان کے دو بیٹے جنہیں وہ یرغمال کے طور پر مدارس لے گئے تھے واپس بھیج دیئے۔سلطان ٹیپو معاہدے کی شرائط کے مطابق پہلے سال ہی انگریزون کو تاوان کی رقم ادا کر چکا تھا، اور اس کے بعد شہزادوں کو اتنی مدت روک کر رکھے رہنے کی کوئی وجہ جواز نہ تھا۔لیکن میر نواز علی کی مداخلت کے

باعث کمپنی کی حکومت صلح کی شرائط کے خلاف کئی مہینے شہزادوں کی واپسی کا مطالبہ ٹا
لتی رہی۔ سلطان کے خلاف میر نظام علی کی مداخلت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ کے
نتائج سے مطمئن نہ تھا اور وہ ان ہڈیوں کو اپنے لیے ناکافی سمجھتا تھا، جو میسور کے مال
غنیمت میں سے اس کے حصے آئی تھیں، وہ سلطان سے کرنول کا علاقہ چھیننے پر بضد
تھا، انگریز کچھ مدت در پردہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ لیکن جنوبی ہند کی
سیاست میں اچانک ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی اور انگریوں نے بدلتے ہوئے حا
لات سے مجبور ہو کر نظام کے نامعقول مطالبات کی تائید وحمایت سے انکار کر دیا،
مہاوجی سندھیا، جو مرہٹہ حکمرانوں میں سب سے زیادہ بااثر، ہوشیار اور دوراندیش
تھا اور جس کی بساط سیاست پر دلی کے مفلوج اور بے بس حکمران شاہ عالم ثانی کی
حیثیت ایک مہرے سے زیادہ نہ تھی پونا پہنچا اور اس نے اپنے غیر معمولی اثر ورسوخ
سے مرہٹوں کی سیاست کا رخ بدل کر رکھ دیا، سندھیا جنوبی ہندستان میں میسور کی
سلطنت کو انگریزون کے راستے کی آخری دیوار سمجھتا تھا، اس نے پیشوا اور اس کے
مشیروں اور جرنیلون کو اس بات کا احساس دلایا کہ تم نے گزشتہ جنگ میں انگریزوں
کا ساتھ دے کر غلطی کی ہے، تم ایک بیرونی خطرے کو اپنی سرحدون کے قریب لے
آئے ہو، تمہارا دشمن سلطان ٹیپو نہیں ہے جس کا خاندان برسوں سے جنوبی ہندوستان
کی سرحدوں پر پہرہ دے رہا ہے، بلکہ وہ لوگ ہیں جن کے کندھے پر بندوقیں رکھ کر
اس ملک کی آزادی اور عزت کے دشمن آہستہ آہستہ دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں،
ہمیں سلطان ٹیپو کی طاقت سے نہیں بلکہ میر نظام علی کی کمزوری سے خوف کھانا چاہیے
جو اپنی حفاظت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کی سنگینیوں کی ضرورت محسوس
کرتا ہے، اگر تمہیں ہوش نہ آیا تو وہ دن دور نہیں جب حیدر آباد کے ہر شہر میں انگر

یزوں کی چھاؤنیاں ہوں گی۔اوروہ ہمیں ایک ایک کر کے نگلنا شروع کر دیں گے،، اصل خطرہ میسور سے نہیں بلکہ حیدرآباد سے ہے۔مہاوجی سندھیا کی آمد سے قبل سلطان ٹیپو کے متعلق ہری پنت کے خیالات میں بھی ایک بہت بڑاانقلاب آچکا تھا،اوروہ انگریزوں کی بجائے سلطان ٹپو کے ساتھ مرہٹوں کے تعلقات استوار کر نے کے لیےکوشاں تھا،لیکن پرس رام بھاؤاورنانافرنویس کی مخالفت کے باعث اس کی کوشیش بارآورثابت نہ ہوئیں،اب پونا میں سندھیا کی آمد کے باعث ہری پنت اور اس کے ہم خیال لیڈروں کے ہاتھ مضبوط ہو گئے،اور پیشوا کو نظام اور انگریزوں کی بجائے سلطان ٹیپو کی طرف مائل ہونا پڑا،لیکن سندھیا اور سلطان ٹیپو کے مابین ابھی خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا کہ سندھیا اور ہری پنت یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے،اوران کی کوشیش کوئی عملی نتیجہ نہ پیدا کر سکیں،تاہم پیشوا اورمرہٹہ سرداروں کواس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ انہیں سلطان ٹیپو کی بہ نسبت انگریزون کی دشمنی اور میر نظام علی کی ابن الوقتی سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے پونا میں سندھیا کےقیام کے دوران میں انگریز بہت پریشان تھےاس کی موت کے بعدوہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایک بہت بڑاخطرہ ٹل چکاہے،تاہم مرہٹوں کی سیاست میں تبدیلی کے آثار دیکھ کرانھوں نے سلطان ٹیپو کوکسی نہ کسی محاذ پرالجھائے رکھنے کی پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اورمدارس میں نظر بند شہزادوں کوعزت و احترام کے ساتھ واپس کر دیا،اس عرصہ میں ڈھونڈیا داغ جوصلح کی شرائط سے بددل ہوکرمیسور سے نکل گیا تھا،مرہٹوں کے خلاف انتقامی کاروایئوں میں مصروف رہا۔ اس نے دھاڑواڑ کےقریب لوٹ مار کرنے کے بعد ہاویری اورشاہنور پر قبضہ کرلیا اورسلطان ٹیپو کی خدمت میں ایلچی بھیج کرمرہٹوں سےمیسور کےتمام علاقے چھیننے

کی پیش کش کی، لیکن سلطان ٹیپو نے اس کے ساتھ کوئی سروکار رکھنے سے انکار کر دیا، ڈھونڈیا داغ سرپھروں کی ایک مٹھی بھر جماعت کے ساتھ کافی عرصہ مرہٹوں کو پریشان کرتا رہا، بالآخر پونا کی حکومت نے دو ہزار سوار اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیئے، اور ڈھونڈیا داغ ایک گھمسان کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد ادھونی کی طرف بھاگ نکلا، ، ایک دن منیرہ اپنے کمرے میں بیٹھی مراد علی کے نام خط لکھ رہی تھی، پیارے برادرم تم نے پچھلے مہینے یہ اطلاع دی تھی کہ تمہیں عنقریب چھٹی ملنے والی ہے، اس کے بعد تمہارا کوئی خط نہیں آیا، تم نے اپنے بھائی جان کے خط کا بھی کوئی جواب نہیں دیا، ان دنوں ہماری گفتگو عام طور پر تمہاری شادی کے موضوع پر ہوتی ہے، اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم دو تین ماہ کی چھٹی لے کر گھر آ جاؤ، میں نے تمہارے لیے ایک رشتہ تلاش کر لیا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے انتخاب کو پسند کرو گے، لڑکی نہایت حسین اور سمجھدار ہے اور ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، میں نے تمہارے بھائی جان کو اس کے باپ سے رشتے کے متعلق بات کرنے کو کہا تھا، لیکن وہ بات کرنے سے پہلے تمہاری رضامندی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، میں بہت خوش ہوں جلد آنے کی کوشش کرو، اور اگر کسی وجہ سے جلدی نہ آ سکو تو جواباً مجھے اس بات کی اجازت دو کہ میں اس لڑکی کی والدہ سے تمہارے رشتے کے متعلق بات کر سکوں، تمہاری بھابھی منیرہ، ہفتے کے بعد ایک سہ پہر انور علی ہاتھ میں ایک کاغذ لیے ہوئے منیرہ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا کہ منیرہ مراد علی کا خط آیا ہے، منیرہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا لائیے انور علی نے جواب دیا میں پڑھ کر تمہیں سنا دیتا ہوں، وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے، انور علی نے خط کا مضمون پڑھنا شروع کیا، مراد علی نے لکھا تھا، بھائی جان اسلام و علیکم، میں

سرحد کی دفاعی چوکیوں کے معائینے کے لیے گیا ہوا تھا، اس لیے آپ کے اور بھابھی جان کے خط کا جواب نہ دے سکا، مجھے ایک ماہ کی چھٹی مل گئی ہے، لیکن میں گھر آنے سے پہلے چچا اکبر خان کے پاس جانا چاہتا ہوں، ایک مدت سے ان کی کوئی اطلاع نہیں ملی، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے حالات معلوم کرنا ہمارا فرض ہے۔ ان سے ملنے کے بعد میں چھٹیوں کے باقی دن آپ کی خدمت میں گزارنے کی کوشش کروں گا، لیکن اگر مجھے ان کے ہاں زیادہ دن ٹھہرنا پڑا تو میں چترل ڈرگ واپس آجاؤں گا، فوجدار نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مجھے تین چار ماہ کے بعد دوبارہ چھٹی مل جائے گی۔ اب مجھے بھابھی جان سے کچھ کہنا ہے۔ انہوں نے پھر میری شادی کا مسلئہ چھیڑ دیا ہے۔ بھائی جان آپ میری سفارش کریں۔ ابھی میرے لیے ان باتوں کو سوچنے کا وقت نہیں آیا۔ بھابھی جان کی خدمت میں میرا اسلام عرض کر دیجیے، منیرہ نے مایوس ہو کر کہا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شادی کے مسلئے کو اتنا غیر اہم کیوں سمجھتا ہے، کاش میں اسے وہ لڑکی دکھا سکتی، انور علی مسکرایا لڑکی دکھانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، میں اپنے بھائی کو جانتا ہوں، منیرہ نے کہا کہ آپ کا مطلب ہے کہ وہ شادی نہیں کرے گا، ضرور کرے گا، کب، جب اس کی مرضی ہوگی،

بائیسواں باب

ایک دوپہر کو مراد علی اکبر خان کے گاؤں سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے ایک ندی کے کنارے اترا، اردگرد گھنا جنگل تھا، مراد علی نے راستے سے چند قدم ہٹا کر ایک درخت کے ساتھ اپنا گھوڑا باندھ دیا، اور ندی کے پانی سے وضو کرنے کے بعد نماز کے لیے کھڑا ہو گیا،، جب وہ نماز سے فارغ ہو کر اٹھنے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ کوئی تیز چیز اس کی گردن کو چھو رہی ہے، اس کی بندوق سامنے پڑی ہوئی تھی لیکن اس کو بندوق اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ ایک ثانیہ کے لیے جھکا اور پھر کود کر کھڑا ہو گیا، آنکھ جھپکنے کی دیر میں وہ اپنی تلوار نکال چکا تھا، لیکن اتنے میں ایک آدمی کے نیزے کی نوک اس کے سینے کو چھو رہی تھی اور اس کے دائیں بائیں دو اور آدمی اپنی بندوقیں سیدھی کیے کھڑے تھے۔ یہ لوگ اپنے لباس سے مرہٹے معلوم ہوتے تھے، مراد علی نے مڑ کر دیکھا تو دو اور مسلح آدمی اس کے گھوڑے کے قریب پہنچ چکے تھے، اس نے اپنی تلوار پھینک دی، مرہٹے نے اطمینان سے اپنا نیزہ جھکاتے ہوئے پوچھا، تم کون ہو مراد علی نے کہا کہ یہ سوال مجھے تم سے پوچھنا چاہیئے تھا، مرہٹے نے دوبارہ اپنے نیزے کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی اور تلخ ہو کر کہا تم ابھی تک یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ادھونی کی گلیوں میں پھر رہے ہو، میں ادھونی سے نہیں آیا، اور تمہیں بات کرنے کے لیے بار بار نیزہ دکھانے کی ضرورت نہیں، میں جانتا ہوں کہ میں اس وقت تمہارے نرغے میں ہوں، تم کہاں سے آئے ہو میں سرنگاپٹم سے آیا ہوں مرہٹہ پریشان سا ہو کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا مراد علی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سے تھیلی نکال کر ان کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا، مجھے افسوس ہے کہ مجھے راستے میں آپ سے اس بات کی توقع نہ

تھی، ورنہ میں آپ کو مایوس نہ کرتا، اس وقت میرے پاس یہی کچھ ہے، مرہٹے نے جھک کر تھیلی اٹھائی، اور آگے بڑھ کر مراد علی کو پیش کرتے ہوئے کہا، اسے اپنے پاس رکھیے اگر آپ سرنگا پٹم سے آئے ہیں تو ہمیں اپنا دوست پائیں گے۔ لیکن ہم آپ کو تھوڑی سی تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ اپنی تلوار اور بندوق اٹھایئے اور ہمارے ساتھ چلیے۔ کہاں مراد علی نے حیران ہو کر پوچھا، ہمارے سردار کے پاس آپ کو زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا، تمہارا سردار کون ہے۔ آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں،۔ اگر آپ سرنگا پٹم کے رہنے والے ہیں تو ہمارے سردار کو اپنا دوست پائیں گے اور اگر آپ نے جھوٹ بولا ہے تو ہمیں پتہ چل جائے گا اور باقی سفر کی تکلیف سے بچ جائیں گے، دوسرے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا، اگر ہمارے سردار کو یہ پتہ چلا کہ آپ جھوٹ بول کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، تو آپ کو اسی جنگل کے کسی درخت کے ساتھ پھانسی دے دی جائے گی۔ ایک آدمی نے مراد علی کا گھوڑا پکڑ لیا اور وہ کچھ کہے بغیر ان کے ساتھ چل پڑا، ندی کے کنارے کنارے گھنے جنگل میں کوئی آدھا میل چلنے کے بعد مراد علی کو ایک جگہ تیس چالیس آدمی دکھائی دیئے، جو ایک بوسیدہ خیمے کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، یہ لوگ مراد علی کو دیکھتے ہی اس کے گرد جمع ہو گئے، ایک نوجوان آگے بڑھ کر چلایا، ارے ظالمو یہ تو میسور کی فوج کے افسر ہیں، میں نیا نہیں کئی بار دیکھا ہے، اگر تم نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو سردار تمہاری کھال اتار لے گا، مراد علی کی پریشانی حیرانی میں تبدیل ہو رہی تھی، خیمے سے ایک آدمی جس کے بازو اور گردن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، نمودار ہوا، اور مرہٹے اس دیکھتے ہی ادھر ادھر ہٹ گئے، مراد علی نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، یہ ڈھونڈیا داغ تھا، وہ آگے بڑھا اور تھوری

دیر مراد علی کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد چلایا ارے آپ مراد علی ہیں، ۔مراد علی نے شکایت کے لہجے میں کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ورنہ آپ کے آدمی اسی جنگل میں مجھے پھانسی دینے کی خوشخبری سنا چکے ہیں، ڈھونڈیا داغ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔آپ کے ایک بال کے بدلے میں ان سب کو پھانسی دے سکتا ہوں، لیکن آپ یہاں کیسے پہنچ گئے ۔میں ابا جان کے ایک دوست کے پاس آیا ہوں، ان کا گاؤں یہاں سے چند میل دور ہے، میرے آدمیون نے آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی تو نہیں کی، نہیں بلکہ میں اس ملاقات کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں لیکن آپ یہاں کیا کر رہے ہیں، میں نے سنا تھا کہ آپ شاہنور تک پہنچ گئے ہیں، ڈھونڈیا داغ مسکرایا میرے دوست میں تو کسی دن پونا پہنچنے کے خواب دیکھ رہا تھا، لیکن اب میں شکست کھا چکا ہوں، دادو پنت گوکھلے میرے آٹھ سو آدمیوں کے مقابلے میں تین ہزار سپاہی لے آیا تھا، شاہنور سے بھاگنے کے بعد میں یہ سمجھتا تھا کہ میرے لیے یہ علاقہ محفوظ ہے، لیکن مرہٹے یہاں بھی میرا پیچھا کر رہے ہیں،، کل ہی مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ مرہٹے سرداروں کا ایک دستہ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر بھیجا گیا ہے، مرہٹہ سوار، آپ کا مطلب ہے کہ مرہٹے سوار ادھونی کے علاقے میں داخل ہو چکے ہیں، ہاں، لیکن نظام یہ سب کیسے برداشت کرے گا، نظام کو اب بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا، پونا کی افواج جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس مرتبہ سلطان کی جگہ نظام پر اپنی قوت آزمائیں گی، مراد علی نے کہا کیا آپ زخمی ہیں، میرے زخم اب ٹھیک ہو گئے ہیں۔آیئے ڈھونڈیا داغ مراد علی کا بازو پکڑ کر خیمے کی طرف چل دیا، تھوری دیر کے بعد وہ خیمے کے اندر بیٹھے اطمینان سے باتیں کر رہے تھے، ڈھونڈیا داغ نے کہا شاہنور پر حملہ کرنے کے بعد

میں نے سلطان معظم کی خدمت میں ایک ایلچی بھیج کر مرہٹوں سے میسور کے مقبوضہ علاقے چھیننے کی پیش کش کی تھی لیکن انہوں نے یہ جواب دیا کہ تم ہمارے لیے پیچید گیاں پیدا کرنے کی کوشش نہ کرو، ہم سختی کے ساتھ صلح کی شرائط پر عمل کرنا چاہتے ہیں ،مراد علی نے جواب دیا کہ اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ ڈھونڈیا داغ نے جواب دیا کہ اب مجھے میسور کے سوا کوئی اور جائے پناہ نظر نہیں آتی، میرے آقا مجھ سے خفا ہیں، لیکن مجھے کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر میں ان کے پاؤں گر پڑوں، تو وہ میری خطائیں بھول جائیں گے، اگر آپ سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کہنا چاہئیں۔ تو یہ بہت بڑا احسان ہوگا میرے بچے کھچے ساتھی اب اس حال میں زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکتے، مراد علی نے جواب دیا کہ آپ کی اعانت میرا فرض ہے، میں چتل ڈرگ سے چند دنوں کی چھٹی پر آیا ہوں، اور اب میں واپس پہنچتے ہی سرنگا پٹم جانے کے لیے مزید چھٹی لینے کی کوشش کرون گا، میری حیثت ایسی نہیں کہ اس سلسلے میں سلطان معظم سے کوئی بات براہ راست کرسکوں، ، تاہم مجھے امید ہے کہ مجھے وہاں کوئی مددگار مل جائیں گے، اگر مجھے چتل ڈرگ سے فوراً چھٹی نہ ملی تو آپ کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا آپ کے ساتھیوں کی فوری مدد کی آسان سی صورت یہ ہے کہ انہیں چتل ڈرگ کی فوج میں بھرتی کرلیا جائے، میری واپسی کے بعد انہیں وہاں بھیج دیں، مجھے یقین ہے کہ ہمارا فوجدار انہیں وہاں لینے سے انکار نہیں کرے گا، ڈھونڈیا داغ نے کہا کہ نہیں جب تک مجھے سلطان کی طرف سے میسور کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی، یہ لوگ میرے ساتھ رہیں گے، میرے بہت سے ساتھی ابھی تک دور دور کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہیں، اور میں انہین ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کروں گا، میں اپنے دو آدمیوں کو آپ کے ساتھ

بھیج دوں گا، آپ کب تک واپس ہوں گے، میں ایک ہفتے تک واپس آجاؤں گا، اور اگر آپ یہاں ہوئے تو آپ کے ساتھیوں کو ساتھ لے جاؤں گا، میں یہیں رہوں گا اور اگر کسی وجہ سے مجھے کوئی اور جائے پناہ تلاش کرنا پڑی تو بھی میں دو آدمیوں کو یہاں چھوڑ جاؤں گا، اور وہ آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے، مراد علی نے کہا کہ بہت اچھا لیکن اگر وہ کسی وجہ سے مجھے نہ مل سکیں تو آپ انہیں چتل ڈرگ بھیج دیجیے گا، اب مجھے اجازت دیجیے، اتنی جلدی کم از کم ایک دن تو میرے پاس ٹھہر یئے، نہیں میں آج شام سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتا ہوں، اگر وقت ملا تو واپسی پر آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا، بہت اچھا اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا، خیمے سے باہر سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور مراد علی اور ڈھونڈیا داغ جلدی سے باہر نکل آئے، ایک سوار ڈھونڈیا داغ کے قریب پہنچ کر جلدی سے نیچے کود پڑا اور اس نے کہا مہاراج وہ سوار جو ہم نے کل دیکھے تھے، مرہٹہ فوج کے سپاہی نہیں بلکہ لٹیرے ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ چند دنوں سے اس علاقے میں لوٹ مار کر رہے ہیں، پچھلے ہفتے اس علاقے کے لوگوں نے انہیں مار کر سرحد کے پار پہنچا دیا تھا۔ لیکن اب وہ دوبارہ واپس آ گئے ہیں، اس وقت وہ جنگ سے نکل کر افغانوں کی بستیوں کا رخ کر رہے ہیں، میں نے ایک جھاڑی میں چھپ کر ان کی باتیں سنی ہیں، وہ کسی بستی پر حملہ کرنے کی نیت سے جا رہے ہیں، مراد علی نے پریشان ہو کر ڈھونڈیا داغ کی طرف دیکھا اور کہا کہ میرے دوست میری منزل مقصود یہی افغانوں کی بستی ہے، اب شاید مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے، میں حاضر ہوں جناب، ڈھونڈیا داغ یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا، تم کیا دیکھ رہے ہو اپنے گھوڑے تیار کرو سلطان ٹیپو کے ایک بہادر سپاہی کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے، اس کے سا

تھی اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈالنے میں مصروف ہو گئے اور اس نے مراد علی سے کہا کہ مجھے تیاری کے لیے صرف دو منٹ چاہئیے، نہیں نہیں آپ زخمی ہیں آپ آرام کر یں، آپ میری فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں، اس نے خیمے کی طرف بڑھتے ہو ئے کہا، تھوڑی دیر کے بعد وہ مسلح ہو کر خیمے سے باہر نکلا اور ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا، مراد علی کے علاوہ کوئی پینتیس سوار اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ تقریباً ایک گھنٹہ جنگل میں گھوڑے دوڑانے کے بعد انہیں ایک طرف سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ ڈھونڈیا داغ نے اپنا گھوڑا روک کر ایک ہاتھ بلند کیا اور اس کے ساتھی رک گئے اس نے کہا کہ اب جنگل ختم ہونے والا ہے اب اس کے آگے بستی کے قریب گنے کے کھیت شروع ہوتے ہیں، ڈھونڈیا داغ کے ساتھیوں نے کسی توقف کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی اور وہ سات آدمی گھوڑوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر آگے بڑھے۔ جنگل کے آگے کچھ زمین خالی پڑی تھی اور اس سے آگے بستی شروع ہوتی تھی، ڈھونڈیا داغ جلدی سے ایک درخت پر چڑھا اور اس کے بعد اس نے نیچے اتر کر مراد علی سے مخاطب ہو کر کہا کہ ڈاکو اس کھیت میں جمع ہو کر فائر کر رہے ہیں، باغ کے دائیں طرف ایک چوراہے میں گنجان درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگا سکتا، لیکن مجھے یقین ہے کہ عقب سے ہمارا عمل انہیں بھاگنے پر مجبور کر دے گا، مراد علی نے بے چین ہو کر کہ کہ ہم وقت ضائع کر رہے ہیں، داغ نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ بھاگتے ہوئے گنے کے کھیتوں کو عبور کرنے لگے، آخری کھیت کے کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم یہیں رہو میں ابھی آتا ہوں، اس کے ساتھی قطار بنا کر کھیت سے چند قدم دور کھڑے ہو گئے اور وہ زمین پر لیٹ کر رینگتا ہوا آگے بڑھا، مراد علی نے اس کی تقلید کی اور چند

منٹ بعد یہ دونوں کھیت کی مینڈیر کی آڑ میں لیٹے ہوئے جائزہ لے رہے تھے، باغ کا پچھلا حصہ خالی تھا اور وہاں جگہ جگہ درختوں کے ساتھ ڈاکوؤں کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے، ڈاکو جن کی تعداد کوئی ڈیڑھ دو سو کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ باغ کے اگلے حصے میں جمع تھے اور گاؤں کی طرف باغ کی مینڈھ ان کے لیے مورچے کا کام دے رہی تھی، دس بارہ آدمی گھوڑوں کی حفاظت کے لیے کھڑے تھے، مراد علی نے اطمینان سے داغ کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب ہمیں جلد بازی کی ضرورت نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ باغ اور گاؤں کے درمیان کافی فاصلہ ہے اور ڈاکوؤں کی گولیاں گاؤں والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں، ڈھونڈیا داغ نے کہا کہ اس وقت ان لوگوں کا مقصد گاؤں والوں کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ ڈاکو یہ چاہتے ہیں کہ گاؤں کے لوگ ڈر کر بھاگ نکلیں، اور انہیں کھلے میدان شکار کھیلنے کا موقع مل جائے گا، اگر گاؤں والے جواب میں گولیاں نہ چلا رہے ہوتے تو یہ لوگ اس وقت گاؤں میں لوٹ مار کر رہے ہوتے، میں چند آدمیوں کے ساتھ گنے کے کھیت کا چکر کاٹ کر باغ کی دائیں طرف سے حملہ کروں گا، آپ باقی ساتھیوں کے ساتھ کھیت میں چھپے رہیں، جب ڈاکو افراتفری کی حالت میں اس طرف ہٹیں تو آپ حملہ کر دیں، مجھے یقین ہے کہ چند منٹ میں میدان صاف ہو جائے گا، تھوڑی دیر کے بعد ڈھونڈیا داغ گنے کے کھیتوں میں غائب ہو چکا تھا، اور مراد علی مینڈھ سے چند قدم پیچھے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا تھا، اچانک باغ کے دائیں طرف سے بندوقوں کے دھماکوں کے ساتھ ساتھ ڈاکوؤں کی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں، اور وہ پریشانی کی حالت میں باغ کے پچھلی طرف ہٹنے لگے، اتنی دیر میں مراد علی اور اس کے تین ساتھی مینڈھ کی آڑ میں لیٹ کر اپنی بندوقیں سیدھی کر چکے تھے۔ گھوڑوں کے قریب پہنچ کر ڈاکوؤں کی

افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کوئی رسی کھول رہا تھا اور کوئی لگام پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی اپنے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں ڈال رہا تھا اور دوسرا اس کا پاؤں کھینچ کر خود سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، مراد علی نے فائر کرنے کا حکم دے اور آن کی آن میں چند آدمی زمین پر ڈھیر ہو گئے، کسی نے بلند آواز میں کہ کہ بھاگو بھاگو اپنی جانیں بچاؤ ہم چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہیں، مراد علی نے بارعب آواز میں کہا کہ تمہارے لیے کہیں کوئی بھاگنے کا رستہ نہیں اپنے ہتھیار پھینک دو، چند ڈاکوؤں نے ہتھیار پھینک دئے باقی چیختے چلاتے واپس مڑے، باغ کے عقب میں دائیں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں بائیں طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔اس کے بعد مراد علی اور اس کے ساتھی تلواریں سونت کر باغ میں داخل ہو گئے اور شکست خوردہ ڈاکوؤں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکنے لگے، جن لوگوں کو گھوڑوں پر سوار ہونے کا موقع ملا تھا وہ باغ کے آگے جوہڑ عبور کر کے مغرب کی طرف نکل گئے، اور باقی پیدل ان کے پیچھے بھاگنے لگے، مراد علی کے ساتھی بھاگنے والوں کا پیچھا کرنے کا خیال چھوڑ کر ہتھیار ڈالنے والے ڈاکوؤں کو ایک جگہ جمع کرنے میں مصروف تھے، داغ ایک قوی ہیکل آدمی کے گلے میں رسی ڈال کر نمودار ہوا اور کہنے لگا کہ ہم نے ڈاکوؤں کے سردار کو گرفتار کر لیا ہے، اس کے ساتھی چار آدمیوں کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ اپنے قیدیوں کے سمیت باغ کو چھوڑ کر ایک کھلے میدان میں پہنچے، ڈھونڈیا داغ نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کہا کہ گاؤں کے لوگ ابھی تک سہمے ہوئے ہیں، مراد علی نے کہا کہ وہ شاید ہمیں بھی ڈاکوؤں کے ساتھی سمجھتے ہوں، داغ نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہ کہ گاؤں کے لوگ ہماری طرف سے دوستی کا ثبوت حاصل کیئے بغیر باہر نہیں آئیں گے، اس لیے ان

قیدیوں کو درختوں کے ساتھ لٹکا دو اور سب سے پہلے ان کے سردار کو پھانسی دے دو۔ مراد علی نے کہا کہ نہیں یہ لوگ ہتھیار ڈال چکے ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ انہیں ادھونی کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے، داغ نے جواب دیا کہ ادھونی میں جن کی حکومت ہے وہ میرے خیال میں ان ڈاکوؤں سے بھی بدتر ہیں، بہرحال وہ ان لوگوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، ڈاکوؤں کے سردار نے پر امید ہو کر کہا کہ سرکار اگر آپ میری جان بخشی کر دیں تو میں بھگوان کی قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ کوئی جرم نہیں کروں گا۔ مراد علی نے کہ کہ اگر اس علاقے کے لوگ تمہاری جان بخشی پر کوئی اعتراض نہ کریں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا، چند آدمی سامنے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، مراد علی نے آگے بڑھ کر بلند آواز میں کہا کہ بھائیو ہم تمہارے دوست ہیں، ڈاکو بھاگ گئے ہیں اور اب تم باہر آ سکتے ہو، داغ اپنے ساتھیون کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ تم اب یہاں سے واپس چلے جاؤ، اب یہاں تمہاری ضرورت نہیں، صرف آٹھ دس آدمی رہ جائیں، اگر ڈاکوؤں کا کوئی گھوڑا تمہیں پسند آ جائے تو لے جاؤ ورنہ گاؤں والوں کے لیے یہیں رہنے دو۔ ہم ابھی جنگل میں تم سے آملیں گے، مراد علی نے کہا کہ ان سے کہیں کہ ایک آدمی میرا گھوڑا یہاں پہنچا دے، مین یہیں سے اس گاؤں کے سردار کی طرف روانہ ہو جاؤں گا، داغ کے ساتھی وہاں سے چل دیئے اور تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی گاؤں ں سے نمودار ہوئے، مراد علی اور داغ نے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر چند منٹ کے اندر اندر گاؤں کے لوگوں کا وہاں ہجوم لگ گیا، مراد علی سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ یک زبان ہو کر قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا مطالبہ کر رہے تھے، اچانک دائیں سمت سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر میں سرپٹ سوار نمودار ہوئے، سب سے

آگے آنے والے سوار نے جس کے لمبے اور سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے، ہجوم کے قریب پہنچ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ گھوڑے کی باگ کھینچی اور گاؤں کے لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے، ایک ثانیہ کے لیے مراد علی کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں، یہ ایک لڑکی تھی، مراد علی کو پہلی نظر میں یہ محسوس ہوا کہ ایک دلکش تصویر ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آگئی ہے۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا کہ آپ نے بہت دیر لگادی، لیکن شکر ہے کہ ان لوگوں کی بروقت مدد سے ہمارا گاؤں بچ گیا۔ ڈاکو بھاگ گئے اور ان کا سردار چند آدمیوں سمیت گرفتار ہو چکا ہے۔ لڑکی نے ایک ہاتھ سے پیشانی پر بکھرے ہوئے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے پوچھا کہ ڈاکوؤں کا سردار کہاں ہے، عمر رسیدہ آدمی نے ایک قوی ہیکل آدمی کی طرف کہ جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اشارہ کر دیا، لڑکی گھوڑے سے اتر کر سردار کی طرف بڑھی۔ مراد علی نے دبی زبان میں گاؤں کے ایک آدمی سے پوچھا یہ کون ہے، یہ سردار اکبر خان کی بیٹی ہے، ثمینہ جی ہاں، مراد علی اس نسوانی حسن اور مردانہ وقار کے ایک پیکر مجسم کی طرف دیکھنے کی بجائے تصور میں ایک بھولی بھالی اور نازک لڑکی کا تصور کر رہا تھا، ثمینہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈاکوؤں کے سردار کے پاس رکی اور اس نے ایک ثانیہ کے توقف کے بعد تماشائیوں کے ہجوم کیطرف دیکھا اور اچانک اپنی تلوار نیام سے نکالتے ہوئے کہ کہ یہ ابھی تک زندہ ہے، اور پھر پلٹ کر اچانک سردار پر یکے بعد دیگرے دو وار کر دیئے، جب اس نے تیسری بار ہاتھ اٹھایا تو مراد علی نے بھاگ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف دھکیل دیا اور کہنے لگا کہ بس کیجئے وہ مر چکا ہے، ثمینہ نے غضبناک ہو کر مراد علی کی طرف دیکھا لیکن اس کی آہنی گرفت میں بے بس ہو کر

رہ گئی، چند سوار گھوڑوں سے کود کر آگے بڑھے، لیکن دیہاتیوں نے ان کا راستہ روک
لیا اور چلا چلا کر کہا کہ انہوں نے ہماری مدد کی ہے انہوں نے ہماری جان بچائی ہے،
ثمینہ غور سے مراد علی کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا غصہ اب حیرت میں بدل چکا تھا،
اس نے پوچھا کہ آپ کون ہیں، میں مراد علی ہوں، ثمینہ نے گردن جھکا لی اور مراد علی
اس کا بازو چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تماشائی دم بخود ہو کر ان کی طرف دیکھ
رہے تھے۔ ثمینہ نے دوبارہ مراد علی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک
رہے تھے، اس نے کہا کہ آپ کو علم نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک
کیا ہے، مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم ---------

------- یہاں تک کہہ کر مراد علی کی زبان رک گئی، نہیں آپ کو یہ معلوم
نہیں کہ ان لوگوں نے کس طریقے کے ساتھ میرے باپ اور بھائی کو قتل کیا ہے،
ورنہ آپ میرا ہاتھ نہ پکڑتے۔ مراد علی کا پورا جسم کپکپا اٹھا۔ اور اس نے کرب آمیز
لہجے میں کہا کہ نہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ داغ نے آگے بڑھتے ہوئے مراد علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہ کہ میرے دوست ایسے لوگوں پر رحم نہیں کھانا چاہیے۔
اب بتایئے کہ باقی قیدیوں کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے، مراد علی نے جواب دیا کہ
مجھے ان لوگوں کے متعلق فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں، ثمینہ نے کہا کہ اگر آپ ان
لوگوں کی جان بخشی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، مراد علی نے جواب دیا
کہ یہ لوگ کسی رحم کے مستحق نہں لیکن میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انہیں ادھونی کی
حکومت کے حوالے کر دیا جائے، ثمینہ نے کہا کہ ادھونی کی حکومت کی طرف سے
ہمیں ایسے فیصلوں کو پنچائیتوں کے حوالے کر دینے کا حکم ہے، داغ نے کہ کہ کاش
میں آپ کی پنچایت کا فیصلہ دیکھ کر جاتا، لیکن اب مجھے دیر ہو رہی ہے، پھر وہ مراد علی

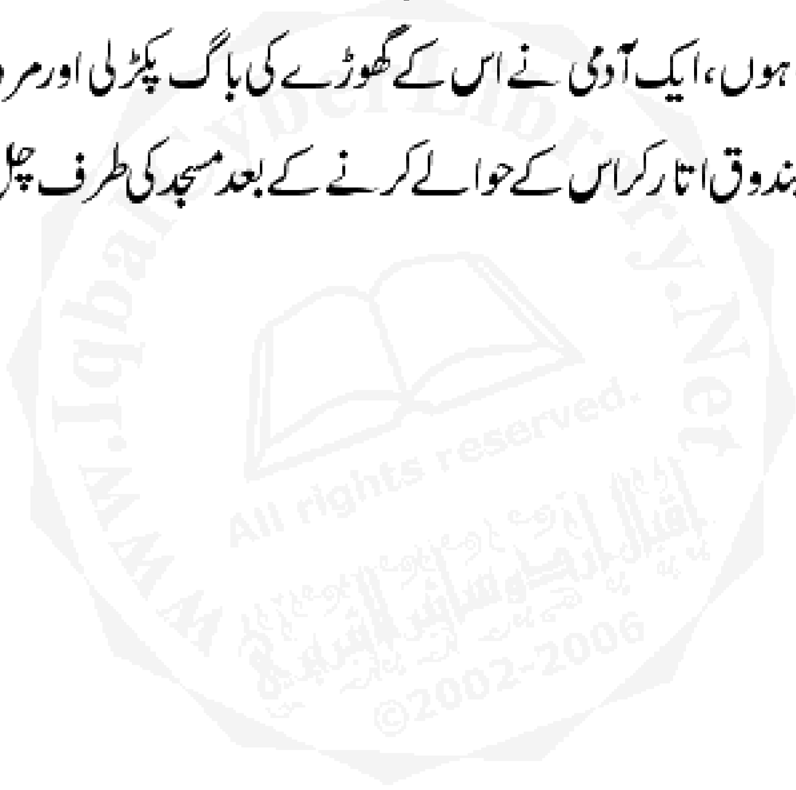
کی طرف متوجہ ہوا۔ میں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا، اب مجھے اجازت دیجیے۔ ثمینہ نے پوچھا کہ آپ ان کے ساتھ آئے ہیں، جی ہاں، لیکن آپ مرہٹے معلوم ہو تے ہیں، جی ہاں لیکن ہر مرہٹہ ڈاکو نہیں ہوتا، آپ نے میرے قبیلے کے لوگوں کی مدد کی ہے میں آپ کی شکر گزار ہوں، لیکن آپ کہاں جارہے ہیں، بہن میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں،۔کس جگہ۔جنگل میں اگر آپ کو پھر میری مدد کی ضروت پڑے تو مجھے آواز دے دیجیے گا، داغ یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا، ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ثمینہ سے کہا کہ گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکو جنگل میں زیادہ دور نہیں گئے، اوران میں سے اکثر اپنے گھوڑے چھوڑ کر پیدل بھاگے ہیں، اگر آپ کی اجازت ہو تو ان کا پیچھا کیا جائے، ثمینہ نے جواب دیا کہ اب ان کا پیچھا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، وہ جنگل میں داخل ہو چکے ہیں اوراب شام ہونے والی ہے، تم بیس آدمیوں کو اس گاؤں کی حفاظت کے لیے چھوڑ دو، اوران قیدیوں کو گاؤں کی پنچایت کے حوالے کردو،



گاؤں کے لوگوں سے کچھ دیر باتین کرنے کے بعد ثمینہ نے مراد علی کی طرف متوجہ ہوکر کہا آیئے میں اب واپس جارہی ہوں، مراد علی نے جواب دیا کہ میں اپنے گھوڑے کا انتظار کررہا ہوں، ثمینہ نے پوچھا کہ آپ کا گھوڑا کہاں ہے، ہم ڈاکوؤں پر حملہ کرنے سے پہلے اپنے گھوڑے یہاں سے دور جنگل میں چھوڑ آئے تھے۔ایک دیہاتی نے کہ کہ جناب جنگل میں ڈاکو کئی گھوڑے چھور گئے ہیں اگر آپ کہتے ہیں تو میں ان میں سے ایک آپ کے لیے لے آؤں، نہیں ڈاکوؤں کے گھوڑے آپ کے

پاس رہیں گے میرا گھوڑا ابھی چند منٹوں میں یہاں پہنچ جائے گا، چند منٹ کے بعد داغ کا ایک ساتھی مراد کا گھوڑا لے کر وہاں پہنچ گیا، اور وہ گاؤں کے لوگوں کی دعائیں لیتا ہوا ثمینہ کے ساتھ چل دیا، راستے میں مختلف بستیوں کے لوگ ان سے جدا ہوتے گئے، اور کوئی پانچ میل چلنے کے بعد ان کے ساتھ صرف تیس آدمی رہ گئے ۔ مراد علی کے دل و دماغ پر اکبر خان اور شہباز کی موت کا گہرا اثر تھا۔ اور وہ راستے میں ثمینہ یا اس کے کسی ساتھی سے کوئی بات نہ کر سکا، اکبر خان اور شہباز کی مختلف تصویریں اس کے سامنے گھوم رہی تھیں، اور اسے اس بات کا احساس قطعاً نہ تھا کہ وہ کس راستے جا رہا ہے، کس سمت جا رہا ہے اور کتنا فاصلہ طے کر چکا ہے، ثمینہ جسے اس نے تھوڑی دیر ننگے سر دیکھا تھا، اب اپنے سنہری بالوں کو سفید اوڑھنی میں چھپائے ہوئے تھی، وہ کبھی کبھی بھاگتے ہوئے گھوڑے سے مراد علی کی طرف دیکھتی، لیکن اسے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا، ایک ٹیلے کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر لی، اور قدرے جرات سے کام لیتے ہوئے مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اب ہم پہنچ گئے ہیں ہمارا گاؤں اس ٹیلے سے صرف ایک کوس دور ہے، مراد علی نے کہا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کا گاؤں اس بستی سے زیادہ دور نہیں ہوگا، ثمینہ نے جواب دیا کہ وہ بستی سرحد کے قریب ہمارے قبیلے کی آخری بستی ہے، اور ہمارے گاؤں سے کافی دور ہے، آپ کی امی جان اور بھائی کا کیا حال ہے، مراد علی نے جواب دیا کہ بھائی جان خیریت سے ہیں اور امی جان فوت ہو چکی ہیں، آپ کی امی جان کیسی ہیں، وہ ٹھیک ہیں، کچھ دیر دونوں خاموش رہے، بالآخر مراد علی نے پوچھا کہ چچا جان اور شہباز کب شہید ہوئے۔ انھیں شہید ہوئے چار مہینے ہو چکے ہیں، تنویر اور ہاشم حیدر آباد میں ہیں، جی ہاں وہ ابا جان اور بھائی جان کی شہادت کے بعد یہاں آئے تھے اور کوئی

ڈیڑھ مہینہ رہ کر واپس چلے گئے تھے، ٹیلہ عبور کرنے کے بعد ان کے چند اور ساتھی راستے کی ایک بستی میں رک گئے اور ثمینہ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہ کہ اب ہمیں گھر جلدی پہنچنا چاہئیے امی جان پریشان ہو رہی ہوں گی، تھوڑی دیر کے بعد وہ گاؤں میں پہنچ گئے، آفتاب غروب ہو چکا تھا اور گاؤں کی مسجد سے اذان سنائی دے رہی تھی، مراد علی گھوڑے سے اتر پڑا اور ثمینہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا کہ میں نماز پڑھ کر آتا ہوں، ایک آدمی نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور مراد علی اپنے کندھے سے بندوق اتار کر اس کے حوالے کرنے کے بعد مسجد کی طرف چل پڑا۔



تیسواں باب

۔۔۔مراد علی نماز سے فارغ ہو کر واپس آیا، تو گھر کے چند نوکر ڈیوڑھی پر اس کا انتظار کر رہے تھے، مراد علی ان کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا کہ ایک نوعمر لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہ کہ جناب آپ کو بیگم صاحبہ نے بلایا ہے، مراد علی اس کے ساتھ چل دیا، مکان کے مردانہ حصہ سے نکل کر وہ اندرونی ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے، کمرے میں چراغ روشن تھا وہ واپس چلا گیا، اور مرداعلی ایک کرسی پر بیٹھ گیا، کمرے میں دیواروں کے ساتھ جگہ جگہ شیروں اور چیتوں کی کھالیں لٹکی ہوئی تھیں، ایک کونے میں لکڑی کا ایک بڑا صندوق پڑا ہوا تھا، اکبر خان کی بیوہ کے ساتھ ملاقات اسے ایک صبر آزما مرحلہ محسوس ہوا تھا۔ بلقیس کمرے میں داخل ہوئی اور مراد علی نے انتہائی کوشش کے بعد جو الفاظ اور احساسات ذہن میں جمع کیے تھے وہ منتشر ہو کر رہ گئے، وہ کرسی سے اٹھا اور لرزتی ہوئی آواز میں چچی جان سلام وعلیکم کہہ کر خاموش ہو گیا، بیٹا جیتے رہو، بلقیس یہ کہہ کر آگے بڑھی اور ایک ثانیہ توقف کے بعد کرسی پر بیٹھ گئی، مراد علی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہ کہ چچی جان مجھے ابھی تک چچا جان اور شہباز خان کی موت کا یقین نہیں آتا۔ بیٹا میں ان کی لاشیں دیکھ کر بھی اپنے آپ کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ زندہ ہیں،، لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے جسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، ہم سب اس سال حج پر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں، اور تمہارے چچا جان کی خواہش تھی کہ حج پر روانہ ہونے سے پہلے ہم چند دن کے لیے سرنگا پٹم جائیں گے، ثمینہ نے مجھے تمہاری امی جان کی وفات کی خبر سنائی ہے مجھے بہت افسوس ہوا ہے، چچی جان میں ایک مدت سے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھ لیکن حالات ایسے تھے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا،

بلقیس نے اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ وہ تمہیں بہت یاد کیا کر تے تھے۔ چچی جان مجھے گاؤں کے کسی آدمی سے ان کی شہادت کی تفصیلات پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں ان سے اتنی دور تھا، بیٹا مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں گاؤں سے باہر نکل کر اس کا راستہ روک سکوں، میں نے ایک نوکر کو اس کے پیچھے روانہ کیا لیکن وہ بھی اس کا ارادہ بدلنے میں کا میاب نہ ہو سکا ان کی موت کی تفصیلات بہت دردناک ہیں اور اگر تم یہاں ہو تے بھی تو کیا کر لیتے، قدرت کو یہی منظور تھا۔ مراد علی کے مزید استفسار پر بلقیس بیگم نے اپنے بیٹے اور شوہر کی شہادت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا۔ ایک دن ہمیں حیدرآباد سے تنویر کے سسر کی موت کی اطلاع آئی اور اگلے دن ثمینہ کے ابا حیدرآباد جانے کے لیے تیار ہو گئے، ہم سب ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن ان کے سمجھانے پر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا، اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمیں حیدرآباد کے طویل سفر میں شہباز کی تکلیف کا خیال تھا، اس کی بینائی اس حد تک زائل ہو چکی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے سیاہی اور سفیدی میں تمیز کر سکتا تھا

،شہباز کے ابا جان نے چھ آدمی اپنے ساتھ لیے اور علی الصبح حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گئے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میں آخری بار انہیں رخصت کر رہی ہوں، اگلے دن پروس کی بستی کا چرواہا دہائی دیتا ہوا ہمارے گاؤں پہنچا اور اس نے بتایا کہ اس نے جنگل میں اپنے سردار اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں دیکھی ہیں، آن کی ان میں گا وں کے لوگ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے اپنا ہوش نہ تھا اور جب میرے حواس درست ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ شہباز بھی ان

کے ساتھ ہی چلا گیا ہے ثمینہ اپنے بھائی کے پیچھے جانے پر بضد تھی لیکن میں نے اسے روک لیا، شام کے وقت جب گاؤں کے لوگ واپس آئے تو وہ اپنے گھوڑوں پر تمہارے پچا جان اور شہباز کے علاوہ چودہ اور آدمیوں کی لاشیں لادے ہوئے تھے، گاؤں کے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ وہ یہاں سے چند میل دور جنگل میں پہنچے تو ایک درخت کے ساتھ ثمینہ کے ابا اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں،، جب وہ درخت سے لاشیں اتار رہے تھے تو پاس ہی کسی گھنی جھاڑی سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور ہمارے چند آدمی زخمی ہو کر گر پڑے۔ ہمارے آدمیوں نے جوابی حملہ کیا اور مرہٹے زخمی ہو کر بھاگ گئے، انہوں نے پانچ مرہٹوں کو زندہ گرفتار کر لیا اور ان سے باز پرس کی تو پتہ چلا کہ مرہٹوں کی باقاعدہ فوج کے چند آدمی میسور کی جنگ سے فارغ ہو کر ادھر آ گئے ہیں، اور وہ سرحدی ڈاکوؤں کی رہنمائی کر رہے ہیں، گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ ڈاکوؤں کی پہلی گولی شہباز کے سینے پر لگی تھی اور اس نے گرتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ ان کا سایہ اٹھنے کی دیر تھی کہ سرحد پار کے وہ ڈاکو جو اس سرزمین پر پاؤں رکھنے کی جرات نہیں کرتے تھے شیر ہو گئے اور انہوں نے دس دن بعد اس علاقے کی ایک بستی پر حملہ کر دیا، ہمارے گاؤں کے چند آدمی یہ اطلاع ملتے ہی حملہ آوروں کے مقابلے پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن گاؤں کی اکثریت ان کا ساتھ دینے میں پس و پیش کر رہی تھی، جب وہ ہمارے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر بحث کر رہے تھے تو ثمینہ مکان کی ڈیوڑھی میں سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد نوکر بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے اور انہون نے یہ اطلاع دی کہ ثمینہ گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل گئی ہے،، میں جلدی سے ڈیوڑھی میں پہنچی تو ثمینہ گھوڑے کی زین پر سوار ہو کر تقریر کر رہی تھی، گاؤں کے لوگ اپنے سردار کی بیٹی

کے منھ سے بزدلی اور بے غیرتی کے طعنے برداشت نہ کر سکے اور آن کی آن میں ہر بوڑھا اور جوان لڑائی پر جانے کے لیے تیار ہو گیا، جب وہ سوار ہو کر یہاں سے نکلے تو ثمینہ کا گھوڑا سب سے آگے تھا، مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک سکوں، میں نے ایک نوکر کو اس کے پیچھے روانہ کیا لیکن وہ اس کا راستہ روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ راست میں گاؤں کے لوگ بھی اس کو سمجھاتے رہے لیکن وہ سب کو یہی جواب دیتی رہی کہ میں سردار اکبر خان کی بیٹی ہوں اپنے گاؤں کے لوگوں کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے، راستے میں کئی اور بستیوں کے لوگ ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور دوپہر کے وقت ہمیں یہ اطلاع ملی کہ لٹیرے تیس لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں، اور دس آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے، جب شام کے وقت ثمینہ آئی تو اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ قیدیوں کو اسی درخت کے ساتھ پھانسی دے دی گئی ہے جس درخت کے ساتھ اس کے ساتھیوں اور ابا جان کی لاشیں پائی گئی تھیں، قبیلے کے لوگوں نے اپنے سردار کی موت کے بعد ہمارے خاندان کے ایک با اثر آدمی کے سر پر پگڑی باندھ دی تھی۔ لیکن اس واقعے کے بعد ثمینہ کا رتبہ سردار سے بلند سمجھا جاتا ہے اور قبیلے کے لوگ اس کے اشاروں پر جان دیتے ہیں، ہاشم اور اس کے خاندان کے کئی لوگ تعزیت کے لیے یہاں آئے تھے اور وہ ہمیں اپنے ساتھ حیدر آباد لے جانے پہ مصر تھے، میں بھی یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں، لیکن قبیلے کے لوگوں کی التجاؤں نے ہمین اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا، نیا سردار ہر گاؤں کے با اثر افراد کا ایک وفد لے کر ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اگر آپ لوگ چلے گئے تو ہم میں سے کوئی بھی یہاں رہنا پسند نہیں کرے گا، اس علاقے کے لوگوں کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے ثمینہ کا یہاں رہنا

ضروری ہے اور ثمینہ یہ کہتی تھی کہ میں آخری دم تک اپنے قبیلے کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کروں گی ،۔۔۔۔۔۔۔۔۔ثمینہ کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ میری بھو لی بھالی ثمینہ اپنے سینے میں ایک شیر کا دل رکھتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور آج ہمارا سارا قبیلہ اس کی بہادری کے گیت گاتا ہے،۔شہباز اور اس کے ابا جان کی وفات کے دو مہینوں کے بعد مرہٹوں نے دوبارہ سرحد عبور کر کے ہماری بستیوں کو لو ٹنے کی کوشش کی تھی، لیکن ثمینہ نے چند خونریز لڑائیوں کے بعد انہیں پھر بھگا دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر امن رہا، لیکن گذشتہ چند دن سے ڈاکوؤں نے پھر لوٹ مار شروع کر دی ہے، بلقیس یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی، مراد علی نے کہا کہ چچی جان آج مجھے ثمینہ کی جرات نے بہت متاثر کیا، لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ چچا جان اور شہباز کی موت کے بعد آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں، میں بھی یہی سمجھتی ہوں لیکن ثمینہ کی مرضی کے خلاف میرے لیے یہ گھر چھوڑنا ممکن نہیں، وہ یہ سمجھتی ہے کہ ہمارا، یہاں سے جانا اپنے قبیلے کے ساتھ بے وفائی اور بدعہدی کے مترادف ہو گا۔ بیٹا ثمینہ کی کئی باتیں میرے لیے معمہ ہیں، بھائی اور باپ کی موت کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے، لیکن وہ ہر شام ان کی قبروں پر چراغ جلا نے جاتی ہے،،شہباز عام طور پر اس کے کمرے میں رہا کرتا تھا اور ثمینہ نے اس کے مرنے کے بعد اس کے یادگاریں اس کمرے میں جمع کر دی ہیں، اس صندوق میں اس کی تلواروں اور کپڑوں کے علاوہ اس کے جوتے ہیں، یہ اس کے گھوڑے کی زین ہے اور کمرے کی دیواروں کے ساتھ اس کے شکار کیے ہوئے شیروں اور چیتوں کی کھالیں لٹک رہی ہیں،۔اس کمرے کو ہمیشہ قفل لگا رہتا ہے اور ثمینہ اپنے سوا کسی اور کو اس کی صفائی کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔لیکن آج وہ میری توقع کے خلاف

وہ خود ہی تم کو یہاں ٹھہرانے پر اصرار کر رہی تھی۔ ثمینہ کو شہباز سے بہت پیار تھا اور آنکھوں سے محروم ہو جانے کے بعد تو وہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی بن چکا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہا کرتی اور اسے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہو نے دیتی تھی کہ وہ بینائی سے محروم ہو چکا ہے۔ جب شہباز گھر بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا تو ثمینہ اسے گھر سے باہر لے جاتی۔ شروع شروع میں وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کا عادی تھا۔ لیکن بعد میں کسی وقت کے بغیر ثمینہ کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ثمینہ مجھے آگے صرف ایک دھندلے آئینے کی صورت میں نظر آتی ہے لیکن اس کے قدموں کی آہٹ سے میں اپنا راستہ دیکھ سکتا ہوں، بینائی سے محروم ہو جانے کے باوجود گھوڑے پر سواری کرنے کے لیے شہباز کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ شروع شروع میں ہمارا خیال تھا کہ مکمل آرام سے اس کی بینا ئی واپس آجائے گی لیکن جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو شہباز کے ابا نے اسے گھوڑے پر سواری کرنے کی اجازت دے دی۔ اور وہ اور ثمینہ ہر روز علی الصبح گھوڑے پر سواری کیا کرتے تھے، ثمینہ کو ہر وقت شہباز کے لیے کوئی نہ کوئی نئی دلچسپی تلاش کرنے کی فکر لگی رہتی تھی۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ شہباز ثمینہ کے ساتھ باہر کے احاطے میں بندوق کے نشانے کی مشق کر رہا ہے، اور مجھے سخت حیرت ہوئی، میں وہاں پہنچی تو شہباز اور ثمینہ چند نوکروں کے ساتھ صحن میں کھڑے تھے، اور ان کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کا تختہ لٹکا ہوا تھا۔ شہباز کے ہاتھ میں بندوق تھی، ثمینہ نے ایک پتھر اٹھایا اور کہا کہ بھائی جان آپ تیار ہو جائیں، شہباز نے دیوار کی طرف بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا کہ میں تیار ہوں، پھر ثمینہ نے تختے پر پتھر مارا اور شہباز نے آواز سنتے ہی بندوق چلادی،۔ میں نے دیکھا کہ جس جگہ ثمینہ کا پتھر لگا تھا اس کے قر

یب ہی شہباز کی بندوق سے دیوار میں سوراخ ہو گیا تھا، ایک نوکر نے خالی بندوق اس کے ہاتھ سے پکڑ لی اور پھر بھری ہوئی بندوق اس کے ہاتھ میں دے دی، شہباز نے اس طرح کئی فائر کیے اور میں وہاں کھڑی دیکھتی رہی، جب ثمینہ نے اسے یہ بتا یا کہ آپ کا نشانہ میرے پتھر کے بالکل قریب لگا ہے تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا، تھوڑی دیر کے بعد اس کے ابا جان بھی آ گئے انہوں نے یہ تماشا دیکھا تو مسکرا تے ہوئے دبے پاؤں آ کر ہمارے قریب کھڑے ہو گئے۔۔ شہباز کے چند نشانے دیکھنے کے بعد انہوں نے ایک لمبی چھڑی منگوائی اور کہا کہ بیٹا اب ثمینہ کی بجائے میں تمہاری رہنمائی کرتا ہوں، یہ کہہ کر وہ دیوار کی طرف بڑھے اور تختے کے بالکل قریب کھڑے ہو گئے۔۔ پھر انہوں نے چھڑی کی نوک سے تختے پر ٹھک ٹھک کرنے کے بعد شہباز کو فائر کرنے کے لیے کہا، تو وہ بولا ابا جان مجھے آپ کی آواز اپنے ہدف کے بالکل قریب سنائی دے رہی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ تم میری فکر نہ کرو میں تختے سے کافی دور ہوں۔۔ اب تیار ہو جاؤ، یہ کہہ کر انہوں نے تختے پر دوبارہ ٹھک ٹھک کی اور شہباز نے گولی چلا دی، اس کا یہ نشانہ بالکل صحیح تھا، اس کے بعد چند ہفتوں میں شہباز کو اتنی مشق ہو گئی تھی کہ وہ پچاس ساٹھ قدم سے ٹھک ٹھک سن کر نشانہ لگا سکتا تھا، اور ثمینہ اسے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھتی تھی، ثمینہ میرے سامنے کبھی اپنے بھائی یا ابا جان کا ذکر نہیں کرتی۔ لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ اس کی زندگی میری نسبت زیادہ المناک ہے، میں اپنی بپتا دوسروں کو سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں لیکن وہ اپنے غم میں کسی کو حصہ دار بنانا پسند نہیں کرتی، ایک نوکر نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا کہ جناب گاؤں کے لوگ باہر جمع ہو رہے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں،

بلقیس نے کہا کہ تم انہیں بٹھاؤ یہ اب کھانا کھا کر جائیں گے، مراد علی نے کہا، چچی جان یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں کھانا کھانے سے پہلے انہیں مل آؤں نہیں بیٹا تمہیں وہاں دیر لگ جائے گی، میں کھانا بھیجتی ہوں، بلقیس یہ کہہ کر وہاں سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی، ۔رات کے دس بجے مراد علی اسی کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا، دن بھر کے واقعات ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔ثمینہ اس کم سن اور بھولی بھالی لڑکی سے کس قدر مختلف تھی جسے اس نے پہلی بار اس گھر میں دیکھا تھا اور جس کے تصور سے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی، وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ اب ثمینہ بڑی ہو چکی ہوگی اور شاید وہ مجھے دیکھے تو پہچان بھی نہ پائے، اور شاید میں بھی اسے پہچان نہ پاؤں، اور چند سالوں کے بعد تو اسے میرا نام تک یاد نہ رہے گا، سرنگا پٹم سے روانہ ہونے کے وقت کے بعد راستے کی منازل میں اکبر خان اور شہباز خان کے ساتھ کئی گئی ملاقاتوں کے تصور میں کبھی کبھار اس کے تصور میں مبہم سی ثمینہ کی تصویر آجاتی تھی، اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ اس کے ماضی اور حال کے درمیان چھ سال کا عرصہ حائل ہے، اور پھر اسے جب اچانک یہ خیال آتا کہ ثمینہ اب جوان ہو چکی ہوگی اور اس کے سامنے آنے سے اجتناب کرے گی تو اسے ایک بے نام سی الجھن ہونے لگتی، اور اب وہ ثمینہ کو دیکھ چکا تھا لیکن اس کی الجھن کم ہونے کی بجائے زیادہ ہونے لگی تھی، وقت کا یہ انقلاب جس نے اکبر خان کی بیٹی اور شہباز خان کی بہن کو پھولوں سے کھیلنے کی بجائے تلوار اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا، مراد علی کے لیے نا قابل برداشت تھا، وہ بار بار اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ، ثمینہ ثمینہ کاش میں تمام عمر تمہارے گھر کے دروازے پر پہرہ دے سکتا، کاش میں انسانیت کے خرمن سے ظلم و وحشت کی وہ آگ بجھا سکتا، جس کی حرارت نے تمہیں گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا

ہے،، دیر تک بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدلنے کے بعد مراد علی کو نیند آ گئی، علی الصبح اس کی آنکھ کھلی تو نماز کا وقت ہو چکا تھا، وہ جلدی سے باہر نکلا اور مسجد کی طرف چل دیا، جب وہ نماز سے فارغ ہو کر کمرے میں آیا تو ثمینہ اس کا بستر درست کر رہی تھی، وہ بے خیالی کے عالم میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور اس نے پریشانی کے عالم میں کہا، معاف کیجئے گا مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ یہاں ہیں، ثمینہ نے بے پروائی سے جواب دیا کہ میں آپ کا کمرہ صاف کر رہی تھی، پھر اس نے ایک کرسی پر پڑے ہوئے چند کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ کپڑے آپ کے لیے ہیں، مراد علی نے کہا کہ آپ کو اس تکلیف کو کرنے کی کیا ضرورت تھی، میرے گھوڑے کی خورجین میں چند فالتو جوڑے پڑے ہوئے تھے، ثمینہ نے مراد علی کی طرف دیکھے بغیر کہا کہ بھائی جان نے اپنی موت سے پہلے چند جوڑے بنوائے تھے اور وہ اسی طرح پڑے ہوئے ہیں، یہ جوڑا میں نے خود تیار کیا تھا، ثمینہ یہ کہہ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی، مراد علی نے کہا کہ ثمینہ ٹھہرو، وہ رک گئی، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، ثمینہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مراد علی کے خیالات پریشان ہو کر رہ گئے، اس نے بڑی مشکل سے کہا کہ ثمینہ میں تمہیں بہت یاد کیا کرتا تھا، لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ہم ان حالات میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے، مجھے تمہارے بھائی جان اور ابا جان کی موت کا بے حد افسوس ہے، مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ان کے ساتھ بہت محبت تھی اور میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے ادھونی میں میرے بھائی کی مدد کی تھی۔ وہ آپ کو بہت یاد کیا کرتے تھے، مراد علی نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا کہ ثمینہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں تمہیں اور چچی جان کو یہاں نہیں رہنا چاہیئے، حیدر آباد آپ کے لیے زیادہ

محفوظ ہوگا، کاش حالات ایسے ہوتے کہ میں آپ کو سرنگا پٹم آنے کی اجازت دے سکتا، ثمینہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ ہم یہاں رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، اور آپ کو ہمارے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے، مراد علی کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہ ہوئی، ثمینہ کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ نڈھال سا ہو کر کمرے میں موجود ایک کرسی پر بیٹھ گیا، مراد علی کو اپنے قیام کے دوران میں ثمینہ سے کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملا، لیکن بلقیس صبح وشام اس کے پاس آتی اور کئی کئی گھنٹے پرانے وقتوں کی باتیں کرتی رہتی، بلقیس کے سامنے بیٹھے بیٹھے جب وہ ثمینہ کے متعلق سوچتا تو اسے اپنے دل پر ایک نا قابل بیان بوجھ محسوس ہوتا، اپنے کمرے سے باہر اس کا بیشتر وقت آس پڑوس کی ان بستیوں کے لوگوں سے ملاقات میں گزرتا جو اسے اپنا محسن خیال کرتے تھے، پھر جب وہ واپس آتا تو کبھی کبھی کمرے کی صفائی یا سازو سامان میں معولی سا تغیر و تبدل اس بات کی گواہی دیتا کہ ثمینہ اسکی غیر موجودگی میں وہاں آچکی ہے، کبھی اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ ثمینہ عمداً اس سے اجتناب کرتی ہے، اور اس کا دل تھوڑی دیر کے لیے شکایات سے لبریز ہو جاتا، پھر خود ہی ثمینہ کے طرز عمل کے جواب میں مختلف دلا ئل تلاش کرتا، ثمینہ کے دل و دماغ پر اپنے بھائی اور باپ کی موت کا گہرا اثر ہے، اور میں نے یکا یک اسے گاؤں سے ہجرت کا مشورہ دے کر خفا کر دیا ہے،، پھر وہ تصور کے عالم میں ثمینہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا، ثمینہ میرا یہ مطلب نہ تھا میں جانتا ہوں کہ تم بہت بہادر ہو، تمہاری رگوں میں ایک غیور باپ کا خون ہے،، لیکن تم ایک لڑکی ہو اور قدرت نے تمہیں آگ کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نہیں پیدا کیا۔ میں تم سے یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ گاؤں محفوظ نہیں، پانچو یں روز وہ عشاء کی نماز پڑھ کر گاؤں کی مسجد سے واپس آیا تو وہ لڑکا جو اس کے لیے صبح

وشام کھانا لایا کرتا تھا، اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا، مراد علی نے
اس سے کہا کہ تم جاؤ اور چچی جان سے کہو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، لڑکا بہت
اچھا جناب کہہ کر چلا گا اور مراد علی اپنے کمرے میں داخل ہوا، تھوڑی دیر کے بعد وہ
بے چینی کی حالت میں کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا۔ کہ بلقیس اندر داخل ہوئی اور اس
نے کہا کہ بیٹا کیا بات ہے۔ چچی جان تشریف رکھیے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور مراد علی
نے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا کہ چچی جان معاف کیجئے گا کہ میں
نے اس وقت آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اب واپس
جانا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو میں صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں، نہیں بیٹا
اتنی جلدی نہ کرو۔ چچی جان میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے خوشی سے اجازت دیں،
میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتی لیکن کیا تم تھوڑی دیر اور نہیں ٹھہر سکتے، تمہیں یہاں دیکھ
کر میں اپنے بہت سے غم بھول گئی تھی، چچی جان آپ جانتی ہیں کہ مجھے یہاں جانے
سے خوشی نہیں ہو گی لیکن یہ ایک مجبوری ہے۔ بہت اچھا بیٹا لیکن یہ وعدہ کرو کہ تم ہمیں
بھول نہیں جاؤ گے، چچی جان میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں مراد علی نے مغموم لہجے
میں جواب دیا، کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے بالآخر مراد علی نے کہا کہ چچی جان
میں نے ثمینہ کو یہ گاؤں چھوڑ دینے کے لیے کہا اور ثمینہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے،
نہیں بیٹا وہ تم سے ناراض نہیں، وہ جانتی ہے کہ دنیا میں تم سے بڑھ کر ہمارا کوئی ہمدرد
اور خیر خواہ نہیں۔ لیکن ابھی تک اس کے دل و دماغ پر اپنے بھائی اور ابا جان کی
موت کا گہرا اثر ہے، مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے تک اس کی طبیعت سنبھل جائے
گی، مراد علی نے کہا کہ چچی جان مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں
آپ کو سرنگاپٹم آنے کی دعوت نہیں دے سکتا، گزشتہ جنگ کے بعد ہم میسور کے افق

پر ایک نئی جنگ کے آثار دیکھ رہے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اس طوفان سے سرخرو ہو کر نکلیں گے، اور میں کسی دن صرف آپ اور ثمینہ کو ہی نہیں، بلکہ قبیلے کے ہر فرد کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے آؤں گا، کہ اب میسور کی سرزمین ہر فرد کے لیے جا ئے پناہ ہے، مراد علی اور بلقیس کچھ دیر باتیں کرتے رہے، بالآخر بلقیس نے اٹھتے ہو ئے کہ کہ بیٹا تم نے صبح کو سفر کرنا ہے، مین صبح تم کو رخصت کرنے آؤں گی، نہیں چچی جان آپ تکلیف نہ کریں میں پچھلے پہر روانہ ہو جاؤں گا، بلقیس کچھ دیر تذبذب کی حا لت میں کھڑی رہی، پھر اس نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ بیٹا دوبارہ کب آؤ گے، چچی جان اگر میسور کے حالات بہتر ہو گئے تو میں بہت جلد دوبارہ آؤں گا، ممکن ہے کہ میرے ساتھ بھائی اور بھابھی جان بھی ہوں آپ دعا کیا کریں کہ جنگ کا خطرہ ٹل جائے، اپنے بھائی اور بھابھی جان کو میرا اسلام کہنا، بہت اچھا، اچھا بیٹا خدا حافظ ان الفاظ کے ساتھ ہی بلقیس بیگم کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، خدا حافظ چچی جان، بلقیس اپنے آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی، چند منٹ کے بعد اس کے کم سن نوکر کمرے میں دا خل ہوا، اور اس نے کہا کہ جناب بی بی جان کہہ رہی ہیں کہ آپ علی الصبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، ہاں میں پچھلے پہر چاند نکلتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا، بہت اچھا میں آپ کو جگا دوں گا، مجھے جگانے کی ضرورت نہیں تم باہر نکلتے ہی نوکروں سے کہہ دو کہ میرا گھوڑا تیار کر دیں اور یہ فالتو کپڑے یہاں سے لے جاؤ اور گھوڑے کی خورجین میں ڈال دو، نوکر نے دیوار کی کھونٹیوں سے کپڑے اکٹھے کرنے کے بعد کہا کہ جناب اگر پچھلے پہر آپ کی آنکھ نہ کھلے تو مجھے کیا کرنا چاہیئے،،،،،،،، بیگم صاحبہ خفا ہوں گی کہ میں نے آپ کو جگایا نہیں، مراد علی مسکرایا، تم جا کر اطمینان سے سو جاؤ،۔۔۔۔۔۔۔۔لیکن ٹھہرو اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اشر

ﻓﯽ نکالی، اور آگے بڑھ کر کچھ کہے بغیر نوکر کی جیب میں ڈال دی، کمسن لڑکے نے سرا پا احتجاج بنتے ہوئے کہا کہ نہیں جناب میں یہ نہیں لوں گا، وہ کیوں، جناب اگر ثمینہ بی بی کو پتا چل گیا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گی، مراد علی نے اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہ کہ تم فکر نہ کرو ثمینہ بی بی کو پتا نہیں چلے گا، پچھلے پہر مراد علی تیار ہو کر کمرے سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دروازے کے باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی، پھر آہستہ آہستہ سے دروازے کا ایک کواڑ کھلا اور پھر ثمینہ ایک ثانیہ جھانکنے کے بعد جھجھکتی ہوئی اندر داخل ہوئی، مراد علی چند لمحے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا رہا، ثمینہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا کہ آپ جا رہے ہیں، ـــــــــ ہاں،،،،،،،،،،،،،اور مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں جانے سے پہلے تمہیں نہیں دیکھ سکوں گا، ثمینہ نے کہا کہ رات امی جان نے مجھے بتایا تھا کہ آپ جا رہے ہیں، اور میں اسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتی تھی لیکن پھر سوچا کہ آپ کے آرام کا وقت ہے، ــــــــــ مین آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں آپ سے خفا نہیں ہوں، مراد علی کا دل اب شکایات کی بجائے تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا، اس نے کہا کہ ثمینہ بیٹھ جاؤ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں، ثمینہ نے ایک ثانیے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی، مراد علی نے مغموم لہجے میں کہا کہ سرنگا پٹم سے روانہ ہوتے وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میں تمہیں اس حال میں دیکھوں گا، ثمینہ اس وقت ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جب مستقبل کے متعلق کوئی بھی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی، تاہم میں اس امید کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں کہ جب میں یہاں دوبارہ آؤں گا تو یہاں کے حالات بدل چکے ہوں گے، اور میں

تمہارے چہرے پر ایک بار پھر وہ مسکراہٹ دیکھ سکوں گا جو کئی برس قبل دیکھی تھی، ثمینہ نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ آپ چند دن اور یہاں ٹھہریں گے، کاش میسور کے حالات ایسے ہوتے کہ میں باقی تمام عمر اطمینان کے ساتھ یہاں گزار سکتا، لیکن جن فرائض کے احساس نے تمہیں یہاں رہنے پر مجبور کیا ہے وہی مجھے سرنگا پٹم بلا رہے ہیں، تم ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی ہو اور میں میسور کے حکمران کا سپاہی ہوں، تمہیں زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ اس لیے محبت ہے کہ اس پر تمہارے باپ اور بھائی کا خون گرا ہے، اور مجھے اس سلطنت کے ساتھ محبت ہے جس کی حفاظت کے لیے میرے دو بھائی اور والد صاحب جانیں دے چکے ہیں، ہم دونوں یکساں بے بس اور مجبور ہیں، لیکن اگر حالات نے اجازت دی تو میں ضرور آؤں گا اور اگر میں یہاں نہ آسکا تو یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں بھول چکا ہوں، میں آگ اور خون کے طوفان میں کھڑا ہو کر بھی اکبر خان کی بیٹی اور شہباز خان کی بہن کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گا، ثمینہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی، اس نے مراد علی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی، ایک ثانیے کے لیے زندگی کی تمام حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آچکی تھیں، پھر اس نے ایک کپکپی لی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا کہ میں مرتے دم تک آپ کی راہ دیکھتی رہوں گی، مراد علی نے کمرے کے ایک کونے سے اپنی بندوق اٹھا کر خدا حافظ کہا لیکن ثمینہ دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر سکی، مراد علی دروازے کی طرف بڑھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔رکا،،،،، پھر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا، ثمینہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی، پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی، صحن عبور کرتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل ہو چکے تھے، وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور

سسکیاں لیتی ہوئی اپنے بستر پر گر پڑی، ثمینہ، ثمینہ کمرے کے دوسرے کونے سے بلقیس بیگم کی آواز سنائی دی، ثمینہ انتہائی کوشش کے اپنی سسکیاں ضبط نہ کرسکی۔ بلقیس اپنے بستر سے اٹھی اوراس کے پاس آکر بولی کہ ثمینہ کیا ہوا تم رو رہی ہو، ثمینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ امی جان وہ جا چکے ہیں، بلقیس ثمینہ کا سر اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی اوراس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔وہ پھر آئے گا بیٹی، ۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔وہ ضرور آئے گا،ثمینہ نے کہا کہ امی جان، ہاں بیٹی، امی جان آپ غلط کہتی تھیں وہ مجھ سے خفا نہیں تھے،نہیں بیٹی میں نے یہ کہا تھا کہ تمہاری باتوں نے شاید اسے پریشان کردیا، ڈھائی ماہ کے بعد مراد علی اور غازی خان شاہی محل کے ایک کشادہ کمرے میں چند ملاقاتیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ایک افسر داخل ہوا اور اس نے غازی خان کوسلام کرنے کے بعد کہا کہ جناب تشریف لائیے، غازی خان نے مراد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو اگر ضرورت پڑی تو تمہین اندر بلا لیا جائے گا، غازی خان فوجی افسر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا، اور مراد علی کچھ دیر پریشانی اور ضطراب کی حالت میں بیٹھا رہا۔کوئی دس منٹ کے بعد وہی افسر دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اوراس نے مراد علی سے مخاطب ہوکر کہا کہا آیئے۔مراد علی کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چلا دیا، کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے، مراد علی کا رہنما ایک کمرے میں داخل ہوا اوراس نے کہا کہ آپ اندر تشریف لے جائیں، مراد علی کو یہ امید نہ تھی کہ غازی خان کے ساتھ اسے بھی سلطان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا، اس کا اضطراب اب خوف میں تبدیل ہو چکا تھا، وہ جھجکتا ہوا کمرہ کے اندر داخل ہوا، میسور کا حکمران اپنی مسند پر رونق افروز تھا، اور غازی خان اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، مراد علی نے سلام کیا اوراس کے سامنے کھڑ

اہو گیا، سلطان نے کسی توقف کے بغیر کہا کہ ڈھونڈیا داغ کو تم نے کہاں دیکھا تھا، عا
لی جاہ میں اسے ادھونی کے ایک جنگل میں ملا تھا، تم وہاں کیسے گئے تھے، عالی جاہ
اس علاقے کے ایک خاندان کے ساتھ ہمارے دیرینہ مراسم ہیں، اور میں ان کے پا
س گیا تھا، سلطان نے کلاہ کہ ڈھوندیا داگ ایک خودسر آدمی ہے اور تمہیں غازی بابا کو
میرے پاس اس کی سفارش کے لیے نہیں لانا چاہیے تھا۔ مراد علی کا دل بیٹھ گیا تاہم
اس نے قدرے جرات سے کام لیتے ہوئے کہا کہ عالی جاہ وہ ایک اچھا سپاہی ہے
اور اپنی سابقہ غلطیوں پر پشیمان ہے، داغ ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنی غلطیوں پر
پشیمان ہوا کرتے ہیں، عالی جاہ اب میسور کے سوا اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں،
بیٹھ جاؤ۔ سلطان نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مراد علی غازی خاں کے قر
یب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلطان کچھ دیر سوچتا رہا بالآخر اس نے کہا۔ میں ایسے لوگون
کو پسند نہیں کرتا جو جذبات سے مغلوب ہو کر سوچتے ہیں، لیکن مجھے اس کی خدمات کا
لحاظ ہے اس وقت وہ کہاں ہے، عالی جاہ وہ ادھونی کی سرحد پر ہماری طرف سے
آپ کے حکم کا انتظار کر رہا ہے، سلطان نے کہا کہ تم اسے ہماری طرف سے یہ پیغام
بھیج دو کہ وہ سرنگا پٹم آ سکتا ہے لیکن یہ اس کے لیے آخری موقع ہوگا، اگر اس نے دو
بارہ کوئی غلطی کی تو اسے وہی سزا دی جائے گی جو ایک عام سپاہی کو دی جاتی ہے، ہم
میر نظام علی، انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ آخری دم تک صلح نبھانا چاہتے ہیں ہمراد
علی کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور اس نے کہا کہ عالی جاہ میں داغ کے دو ساتھی
اپنے ساتھ لایا تھا، اگر حکم ہو تو انہیں آج ہی یہ پیغام دے کر واپس بھیج دوں، بہت
اچھا لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر داغ نے دوبارہ کوئی غلطی کی تو غازی بابا دوبارہ اس کی سفا
رش لے کر میرے پاس نہیں آئیں گے، عالی جاہ وہ آپ نے طرز عمل پر بہت شرمندہ

ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ اس سے کوئی غلطی نہیں ہوگی، مراد علی اور غازی اٹھے اور ادب سے سلام کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے، مراد علی نے کہا کہ جناب میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں، غازی خان نے بے پروائی سے جواب دیا بیٹا تمہیں شکر گزار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ اپنی فوج کے لیے ایک بہادر سپاہی کی سفارش کی ہے، ڈھونڈیا داغ کو میری طرف سے بھی یہ پیغام دو کہ میرے دستوں میں ایک تجربہ کار افسر کی جگہ خالی ہے، چھ ہفتے کے بعد سرنگا پٹم میں اس بات کے چرچے ہو رہے تھے کہ ڈھونڈیا داغ واپس آ گیا ہے اور اس کے دو سو ساتھیوں کو دوبارہ سلطان کی فوج میں جگہ مل چکی ہے۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔پھر چند دن کے بعد یہ خبر سنی گئی کہ ڈھونڈیا داغ مسلمان ہو چکا ہے اور اس کے کئی ساتھی بھی مسلمان ہو چکے ہیں، اور اب اس نڈر سپاہی کو ڈھونڈیا داغ کی بجائے ملک جہان خان کے نام سے پکارا جائے،

چوبیسواں باب

جنگ کے بعد سلطان کی تمام تر توجہ سلطنت کے انتظام اور رعایا کی ترقی اور خوشحالی کے کاموں پر مرکوز ہو چکی تھی، لیکن میر نظام علی نے کرنول کا جھگڑا کھڑا کر کے پھر ایک ناخوشگوار صورت حال پیدا کر دی تھی، ابتداً میں میر نظام علی کو یہ توقع تھی کہ وہ کرنول پر اپنا حق جتانے کے لیے انگریزوں اور مرہٹوں کی تائید حاصل کر سکے گا، لیکن مرہٹے نظام کی خاطر سلطان ٹیپو کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور سر جان شور بھی صرف نظام کے فائیدے کے لیے سلطان کے ساتھ الجھنے پر تیار نہ تھا، تاہم میر نظام علی کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر وہ کرنول کے علاقے پر زبردست قبضہ کر لے تو سلطان ایک نئی جنگ کے خوف سے سر اٹھانے کی جرات نہیں کرے گا، اور اگر اس مسلئے پر جنگ چھڑ گئی تو انگریز اور مرہٹے اپنی مرضی کے خلاف بھی جنگ میں حصہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے ۱۷۹۵ کے آخر میں سلطان پر دباؤ ڈالنے کے لیے میر نظام علی کی فوج نے نقل و حرکت شروع کر دی اور سلطان کی پریشان حال رعایا کو ایک بار پھر میسور کے افق پر جنگ کے بادل دکھائی دینے لگے، لیکن ایک دن میر نظام علی حیرت اور استعجاب کی حالت میں یہ خبر سن رہا تھا کہ پونا سے مرہٹوں کی ٹڈی دل فوج پیش قدمی کر رہی ہے اور اس مرتبہ اس کا رخ سرنگا پٹم کی بجائے حیدر آباد کی طرف ہے، پھر چند دن بعد اسے یہ خبر ملی کہ وحشت و بربیت کا یہ سیلاب دکن کی سرحد عبور کر چکا ہے، میر نظام علی کو بادل نخواستہ میدان میں آنا پڑا، مرہٹوں نے اسے عبرتناک شکست دی اور صلح کے لیے انتہائی تو ہین آمیز شرائط ماننے پر مجبور کر دیا، وہ مشیر الملک کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے، اور میر عالم اس کی جگہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا، جنگ سے اختتام کے ایک ہفتے کے بعد میر عالم اور

امتیاز الدولہ نظام کی مسند کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور میر نظام علی نہایت اضطراب کی حالت میں میر عالم سے مخاطب ہوکر کہہ رہا تھا کہ تم تو کہتے تھے کہ ہم کر نول پر زبردستی قبضہ کرلیں تو مرہٹے اور انگریز ہمارے دیکھا دیکھی میسور کے چند اور علاقوں کا مطالبہ کردیں گے، پھر جب مرہٹے فوج کی نقل وحرکت کی خبر آئی تو تم مجھے یہ خوش خبری سنارہے تھے کہ مرہٹے میسور کے کسی علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے ہم سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں، اس کے بعد جب یہ اطلاع آئی کہ ان کا رخ ہماری طرف ہے تو تم بھی پورے وثوق کے ساتھ یہ کہتے تھے انگریز ہمارے خلاف ان کی کوئی زیادتی برداشت نہیں کریں گے سر جان شور بہت اچھا آدمی ہے، اور وہ مرہٹوں کے حملوں کی خبر سنتے ہی ہمارے لیے فوج روانہ کردے گا۔اب تم ایک ہفتے سے ہمیں یہ امید دلا رہے ہو کہ انگریز مرہٹوں کے خلاف ہمارے ساتھ دفاعی معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں گے تم کیناوے کے ساتھ بات چیت کررہے تھے، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمہاری بات چیت کا نتیجہ کب ظاہر ہوگا، میر عالم نے کہا کہ عالی جاہ سر جان کیناوے ابھی حضور کی خدمت میں حاضر ہوجائیں گے، امتیاز الدولہ نے کہ کہ عالی جاہ کیناوے کی حاضری ہماری شکست کا بدلہ نہیں ہوسکتی، وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا کہ سر جان شور کو ان واقعات کا بہت افسوس ہے اور میں اس کی زبان سے یہ فقرہ کئی بار سن چکا ہوں، میر عالم نے انتہائی غصے کے عالم میں امتیاز الدولہ کی طرف دیکا اور پھر نظام علی کی طرف متوجہ ہوکر کہا عالی اجاہ دکن پر یہ حملہ مرہٹوں نے سلطان کے ایماء پر کیا ہے، انگریز مرہٹوں کے عزائم سے بے خبر تھے ورنہ وہ ضرور مداخلت کرتے، ہم نے اس جنگ میں بہت نقصان اٹھایا ہے، لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ انگریز کرنول پر ہمارا حق تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائیں گے، میں کینا

وے سے یہ بات منوا چکا ہوں کہ سلطان ٹیپو درپردہ مرہٹوں کا حلیف بن چکا ہے،
امتیاز الدولہ نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ جب میسور کے
ساتھ ایک نئی جنگ لڑنے کے لیے انگریزوں کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو وہ میر
عالم کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے، لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ
وہ جنگ جیتنے کے بعد میسور کے مفتوحہ علاقوں پر اپنا حق نہیں جتائیں گے،۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔عالی جاہ میں ایک بار پھر یہ عرض کرتا ہوں، کہ جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو
کا کوئی دوست نہیں، آج مرہٹے بھی اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں، کہ انھوں نے
گذشتہ جنگ میں سلطان ٹیپو کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے میں غلطی کی تھی،
لیکن ہم ابھی تک اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز نہیں کر سکے،۔ایک افسر کمرے
میں داخل ہوا اور اس نے کورنش بجالانے کے بعد کہا کہ عالی جان سر جان کیناوے
حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں، انہیں کہو کہ ہم ایک گھنٹے
سے ان کا انتظار کر رہے ہیں، افسر فرشی سلام کرنے کے بعد کمرے سے نکل گیا،، چند
ثانیے کے بعد سر جان کیناوے کمرے میں داخل ہوا اور میر نظام علی سے مصافحہ کر
نے کے بعد میر عالم کے سامنے ایکل کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا، یور ہائی نس مجھے ابھی
یہ اطلاع ملی ہی کہ مدارس کی حکومت نے پیشوا اور رنا فرنویس کو احتجاجی مراسلے بھیج
دئے ہیں، امتیاز الدولہ نے کہ کہ جناب ہم آپ کے شکر گزار ہیں، لیکن احتجاجی مرا
سلوں سے کیا ہوگا، مجھے یقین ہے کہ مرہٹے دوبارہ ایسی جرات نہیں کریں گے، اگر
آپ کے احتجاجی مراسلے میں اتنا اثر ہے تو آپ کو جنگ سے پہلے یہ تکلیف کرنی چا
ہیئے تھی، کیناوے نے امتیاز الدولہ کی طرف توجہ دینے کی بجائے

نظام سے مخاطب ہو کر کہا، یور ہائی نس میں آپ کو ایک اور خوش خبری سناتا ہوں

مجھے پونا سے یہ اطلاع ملی ہے کہ مرہٹے سرداروں میں پھوٹ پڑ چکی ہے، امتیاز الدولہ نے پھر کہا کہ مرہٹے سرداروں کی پھوٹ ہماری عزت اور آزادی کی ضمانت نہیں ہو سکتی، وہ کسی وقت بھی متحد ہو سکتے ہیں، ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آئیندہ اگر وہ دکن پر حملہ کر دیں تو آپ کا طرز عمل کیا ہو گا، کیناوے نے جواب دیا کہ مجھے یقین ہے کہ مرہٹے دوبارہ ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے، میر نظام علی نے کہا کہ مرہٹوں کو ایسے قدم سے باز رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے درمیان ایک دفاعی معاہدہ ہو جائے اور اگر آپ پسند کریں تو سلطان ٹیپو کو بھی اس معاہدے میں شامل کیا جا سکتا ہے، مرہٹوں نے ہمیں سلطان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا ہے، کیناوے نے کہ کہ سلطان ٹیپو آپ کے ساتھ صرف ایک شرط پر معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہو گا اور وہ یہ کہ آپ اس کے مقبوضہ علاقے واپس کر دیں، اور میرے خیال میں یہ شرط آپ کے لیے کسی بھی صورت قابل قبول نہیں ہو گی، میر نظام علی سوچ میں پڑ گیا، امتیاز الدولہ نے کہا، اگر سلطان ٹیپو اپنے علاقوں کا مطالبہ کیے بغیر ہمارے ساتھ معاہدہ کرنے پر تیار ہو جائیں تو آپ کا کیا ردعمل ہو گا، کیناوے نے جواب دیا کہ پھر ہمیں سوچنا ہو گا کہ اس معاہدے کے خلاف مرہٹوں کا ردعمل کیا ہو گا،

کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی اور نظام انتہائی بے بسی اور اضطراب کی حالت میں کیناوے کے طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر کیناوے نے کہا۔ یو ہائی نس آپ کو ہم پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ مرہٹوں پر ہمارا احتجاج بے اثر ثابت نہیں ہو گا اور اگر وہ راہ راست پر نہ آئے تو ہم پوری دیانت داری سے

آپ کا ساتھ دیں گے۔

میر نظام علی نے کہا لیکن آپ کو ہمارے ساتھ دفاعی معاہدہ کرنے میں کیا اعتراض ہے؟

ہمیں صرف یہ ڈر ہے کہ ایسا معاہدہ مرہٹوں کو برانگیختہ کر دے گا اور وہ ٹیپو کے ساتھ مل جائیں گے۔

نظام نے کہا۔ لیکن اگر ٹیپو ہمارے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر آپ کا یہ خدشہ دُور نہیں ہو جائے گا؟

نہیں۔

وہ کیوں؟

وہ اس لیے کہ مرہٹے ہماری نیت پر شک کرنے لگ جائیں گے۔ ہم اس بات کا ذمہ لینے کے لیے تیار ہیں کہ مرہٹے آپ کے ساتھ آئندہ کبھی لڑائی نہیں کریں گے۔ لیکن کمپنی سُلطان ٹیپو کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر کے مرہٹوں کے خلاف فریق بننے کے لیے تیار نہیں ہو گی۔

سر جان کیناوے کوئی ایک گھنٹہ میر نظام علی کے ساتھ بحث کرنے کے بعد چلا گیا اور میر نظام نے امتیاز الدولہ سے کہا۔ امتیاز تم آج ہی سُلطان ٹیپو کو یہ پیغام بھیج دو کہ ہم ان کے ساتھ دفاعی معاہدہ کی بات چیت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

چند ہفتے بعد ٹیپو کے ایلچی حیدر آباد پہنچ چکے تھے اور میر نظام علی کے ساتھ ان کی طویل ملاقاتیں شروع ہو چکی تھیں۔ سُلطان ٹیپو میر نظام علی کی تمام سابقہ غلطیاں بھول جانے پر آمادگی ظاہر کر چکا تھا۔ لیکن نظام علی سُلطان کی طرف اپنا میلان ظاہر کر کے صرف انگریزوں کی منڈی میں اپنی قیمت بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک طرف

سُلطان کے ایلچیوں سے ملاقاتیں کر رہا تھا اور دوسری طرف اس کے جاسوس سرجان کیناوے کو متاثر کرنے کے لیے اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے تھے کہ میسور کا حکمران میر نظام لعی کو انگریزوں کے خلاف اُکسا رہا ہے اور اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں کہ دکن اور میسور کی حکومتیں مرہٹوں کے علاوہ انگریزوں کے خلاف بھی کوئی دفاعی معاہدہ کرلیں۔ میر نظام علی کی منافقانہ روش زیادہ عرصہ سطان ٹیپو کو دھوکا نہ دے سکی اور اس نے اپنے ایلچیوں کو واپس بُلا لیا۔



گزشتہ جنگ میں آدھی سلطنت کی آمدنی سے محروم ہو جانے کے باوجود میسور کا عظیم معمار چند سال کے اندر اندر پھر ایک بار ایسٹ انڈیا کمپنی اور اپنے ہمسایہ حکمرانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر چکا تھا۔ سرنگا پٹم، چتل ڈرگ، بنگلور، بدنور اور میسور کے دوسرے شہروں میں لاتعداد کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ ان کارخانوں کی مصنوعات مشرق کی منڈیوں میں یورپ کے مال سے زیادہ مقبول تھیں۔

تجارت کے میدان میں انگریزوں اور فرانسیسوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سلطان بیرونی ممالک میں تجارت خانے قائم کر رہا تھا۔ میسور کے شہروں میں فرانس، ترکی، عرب، ایران، چین اور آرمینیہ کے کئی تاجر آباد ہو چکے تھے۔ اپنی رعایا کو تجارت کی طرف مائل کرنے کے لیے سُلطان نے حکومت کی نگرانی میں ایک تجارتی کمپنی قائم کی تھی جس میں ہر آدمی حصہ دار بن سکتا تھا۔

اس کمپنی کے قیام کا مقصد امراء کی بجائے معمولی حیثیت کے لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچانا تھا مثلاً جو لوگ اس کمپنی میں پانچ ہزار سے زیادہ روپیہ لگاتے تھے انہیں ہر سال ۱۲ فیصد منافع ملتا تھا۔ اور جو لوگ پانچ ہزار تک لگاتے تھے انہیں ۲۵ فیصد

منافع تھا لیکن

زراعت کے میدان میں بھی سلطنت خُداداد ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کہیں آگے تھی۔ باقی ریاستوں میں لاکھوں کسان چند بڑے زمینداروں یا جاگیرداروں کے لیے عیش و آرام کا سامان مہیا کرتے تھے لیکن میسور میں نئے نئے زرعی منصوبوں سے جو آراضیات آباد ہوتی تھیں ان پر کاشت کاروں کا حق مقدم سمجھا جاتا تھا اور بڑے بڑے زمینداروں کی فالتو آرضیات بھی کاشت کاروں میں تقسیم کی جا رہی تھیں۔

اپنے محدود وسائل سے سُلطان ایک بڑی فوج رکھنے کے قابل نہ تھا۔ تاہم میسور کی تیسری جنگ کے بعد سلطان نے ملک کے دفاعی اور تجارتی ضرورت کے پیشِ نظر بڑی شدت کے ساتھ اپنے بحری بیڑے کو مضبوط بنانے کی کوشش کی چنانچہ منگلور اور واجد آباد کی گودیوں میں اس نے نئے جنگی اور تجارتی جہاز تعمیر کرنے کا حکم دیا اور ایک قلیل مدت میں میسور کے بحری بیڑے میں بائیس جنگی اور بیس تجارتی جہازوں کا اضافہ ہو چکا تھا اور ان جہازوں کے ماڈل سلطان نے خود تیار کیے تھے۔

میسور کے دشمن سلطان کی آدھی سلطنت چھیننے کے بعد یہ سمجھتے تھے کہ اب وہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہا اور اب اسے اپنی رعایا کے معاشی اور اقتصادی مسائل ہمیشہ پریشان رکھیں گے۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ میسور میں پھر ایک بارولولوں کی نئی دنیا آباد ہو رہی ہے۔ اہلِ میسور کے وہ زخم جنہیں وہ دائمی ناسور خیال کرتے تھے۔ مندمل ہو چکے تھے۔ وہ قافلہ جسے انہوں نے بھیانک تاریکیوں کی آغوش میں دھکیل دیا تھا، ایک ناقابلِ یقین عزم و استقلال کے ساتھ اپنے روشن مستقبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے جن بستیوں کو ویران کر دیا تھا وہ دوبارہ

آباد ہو رہی تھیں میسور کے چرواہے، کسان، مزدور، سپاہی،

بقیہ فٹ نوٹ: سے پانچ سو تک کے حصہ داروں کو ہر سال ۵۰ فیصد منافع دیا جاتا تھا۔ ملک کے پسماندہ طبقے کو سرکاری اعانت کا زیادہ مستحق سمجھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ میسور میں ادنیٰ اور اعلیٰ طبقوں میں جو خلا تھا اُسے پُر کرنے کے لیے ایک متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔

تاجر اور صنعت کار پھر ایک بار زبانِ حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ میسور ہمارا ہے۔

اور انگریز یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان میں ان کے راستے کا آخری حصار پھر مضبوط ہو رہا ہے۔ اب دلی تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ قلعہ ہمیشہ کے لیے مسمار کر دیا جائے۔ سلطان ٹیپو کے خلاف انگریزوں کے نئے جارحانہ عزائم میں کچھ بیرونی محرکات بھی شامل تھے۔ نپولین بونا پارٹ کے عروج کے ساتھ فرانس کے تنِ مُردہ میں ایک نئی روح بیدار ہو رہی تھی۔ اس جواں سال جرنیل کی قیادت میں فرانس کی افواج آسٹریا کے شہنشاہ کو شکست دینے کے بعد اطالیہ پر اپنی فتوحات کے پرچم نصب کر چکی تھیں۔ ایک کمزور اور مفلوج بادشاہت کے خاتمے کے بعد فرانس کو ایک اولوالعزم لیڈر مل چکا تھا۔ نپولین نے ایک ہی یلغار میں یورپ میں طاقت کا توازن درہم برہم کر دیا تھا اور انگریز مشرق و مغرب میں اپنے اقتدار کے لیے ایک نیا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ یورپ میں نپولین کے ساتھ اُلجھنے کی صورت میں ان کے لیے اپنے ہندوستانی مقبوضات کی حفاظت مشکل ہو جائے گی اور سلطان ٹیپو اپنی رہی سہی قوت کے ساتھ بھی ان کے لیے ایک خطرہ عظیم بن سکتا ہے۔ چنانچہ سر جان شور کے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں ہندوستان

میں اپنے سامراجی مقاصد کو تقویت دینے کے لیے کسی مضبوط اور ہوشیار آدمی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ مضبوط اور ہوشیار آدمی جس میں ایک سامراجی بھیڑیے کے تمام خصائل بدرجہ اتم موجود تھے۔ رچرڈ ولزلی (ارل آف مانگٹن) تھا۔



ولزلی گورنر جنرل کے عہدے کا چارج لیتے ہی کسی تاخیر کے بغیر میسور پر دھاوا بولنے کے لیے بے تاب تھا۔ چنانچہ اس نے کمپنی کی افواج کو کارمنڈل اور مالابار کے ساحلوں پر جمع ہونے کا حکم دیا۔ میسور کی خلاف جارحانہ اقدام کے لیے ولزلی کو صرف ایک بہانے کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے سلطان ٹیپو پر یہ الزام لگا دیا کہ وہ ایسٹ کمپنی کے خلاف فرانس کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اور اس کے سفیر ماریشیس کے گورنر کی وساطت سے فرانسیسی حکومت کے ساتھ ایک دفاعی اور جارحانہ معاہدہ کر چکے ہیں۔ اصل واقعہ صرف یہ تھا کہ نظام اور مرہٹے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے فرانسیسی سپاہیوں اور افسروں کو بھرتی کر رہے تھے۔ سلطان ٹیپو نے بھی چند تجربہ کار یورپین افسروں کی ضرورت محسوس کی۔ سرنگاپٹم کے دو تاجر اپنے کاروبار کے سلسلے میں ماریشیس جا رہے تھے اور سلطان نے انہیں ہدایت کی کہ اگر ماریشیس سے کوئی کارآمد آدمی ملیں تو انہیں اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ ان تاجروں نے ماریشس پہنچ کر وہاں کے فرانسیسی گورنر سے ملاقات کی اور انہیں قریباً ایک سو بے کار آدمیوں کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن ان سو آدمیوں میں سے بھی صرف چند ایسے تھے جو تھوڑا بہت فوجی تجربہ رکھتے تھے اور بیشتر وہ قیدی تھے جنہیں ماریشس کی حکومت نے جیلوں سے نکال کر سرنگاپٹم کے تاجروں کے ساتھ جہاز پر سوار کرا دیا تھا۔ لیکن کمپنی نے اس واقعہ کی آڑ لے کر سلطان کے خلاف بہتان تراشی کا ایک

طوفان کھڑا کر دیا۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی سے لے کر لندن تک برطانوی سامراج کے ڈھنڈورچیوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ انگلستان کے خلاف میسور اور فرانس کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ ماریشس کے فرانسیسی فوج عنقریب ہندوستان کے ساحل پر اُترنے والی ہے اور سلطان ٹیپو ان کے پہنچتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا۔

ماریشس کے واقعات کے بارے میں ولزلی کے علاوہ کئی اور انگریزوں کے مُتضاد بیانات ان بے سروپا الزامات کو جھٹلانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سلطان ٹیپو نے واقعی ماریشس کے گورنر کی وساطت سے فرانسیسی حکومت کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا تو بھی کوئی انصاف پسند آدمی انگریزوں کو سلطان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں دے سکتا۔ گزشتہ واقعات کی روشنی میں سُلطان کے بدترین دشمن بھی ان پر الزام نہیں لگا سکتے کہ انہوں نے صلح کی شرائط پورا کرنے میں کوئی کوتاہی کی تھی اور انگریزوں کے بہترین وکیل بھی ان کی پے در پے بد عنوانیوں پر پردہ نہیں ڈال سکے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سرنگاپٹم کے معاہدے کی مضحکہ خیز تاویلوں سے یہ ثابت کر چکی تھی کہ انگریز صلح یا جنگ میں کسی ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں۔ ان کی مسلسل بد عہدیوں کے بعد یہ سلطان کا حق ہی نہیں بلکہ فرض تھا کہ وہ ان کا حساب چکانے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔ اگر سلطان فرانسیسیوں پر اعتماد کر سکتا اور ان کی مدد سے انگریزوں کو اس ملک سے نکال سکتا اور اس کے باوجود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تو میں اسے اس کی بصیرت اور جذبہ حُریت کی توہین سمجھتا۔ لیکن میسور کا یہ رجلِ عظیم ان لوگوں میں سے نہ تھا جو دانستہ ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسا جانا گوارا کر سکتے

ہیں۔فرانسیسی منگلور کی جنگ میں فیصلہ کن مرحلہ میں اسے دھوکا دے چکے تھے اور اس کے بعد اس نے انگریزوں، مرہٹوں اور میر نظام علی کے ساتھ تمام جنگیں تن تنہا لڑی تھیں۔فرانسیسی حکومت کی بدعہدیوں کے خلاف اس کا ردِعمل اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ سے قریباً ایک سال بعد پانڈی چری کے فرانسیسی گورنر نے انگریزوں کی جارحیت سے مجبور ہو کر سلطان سے امانت کی اپیل کی تھی تو اس نے اس کا خط کا جواب دینے سے انکار کر دیا تھا اور فرانسیسوں کو بحالتِ مجبوری پانڈی چری خالی کرنا پڑا تھا۔

رہا یہ سوال کہ سرنگاپٹم کے تاجر سلطان کے ایما پر ماریشس سے چند آدمی اپنے ساتھ لے آئے تھے تو یہ بات کتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ مرہٹوں اور نظام کی فوج میں تو سینکڑوں فرانسیسی، انگریزوں کے لیے کسی خطرے کا باعث نہ تھے لیکن سلطان ٹیپو نے صرف سو آدمیوں کو اپنی ملازمت میں لے کر ان کے لیے ایک خطرہ پیدا کر دیا تھا۔پھر ان سو آدمیوں میں سے صرف چالیس فرانسیسی تھے اور باقی ماریشس کے مقامی باشندے تھے۔سلطان کی فوج میں کوئی فرانسیسی یا یورپین کسی اہم عہدے پر فائز نہ تھا لیکن میر نظام علی کی فوج کے پندرہ ہزار سپاہی ایک فرانسیسی جرنیل کے ماتحت تھے اور سندھیا کی چالیس ہزار فوج کو ایک فرانسیسی افسر تربیت دے رہا تھا۔

انگریزوں نے ماریشس کے واقعات کے آڑ لے کر دو باتیں مشہور کی تھیں۔ اول یہ کہ نپولین بونا پاٹ مصر اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک کو فتح کرنے کے بعد خشکی کے راستے ہندوستان کا رُخ کرے گا اور سلطان ٹیپو اس کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔دوسرے یہ کہ ماریشس کے گورنر جنرل نے سلطان ٹیپو کے سفیروں کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ عنقریب تیس چالیس ہزار سپاہی سلطان کی مدد کے لیے بھیج

دے گا۔ انگریزوں کے اپنے بیانات اس بات کو جھٹلاتے ہیں کہ ماریشس میں فرانسیسوں کی اتنی بڑی فوج موجود تھی اور سلطان ٹیپو جیسے باخبر انسان کے متعلق یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اسے ماریشس کے حالات کا صحیح علم نہ تھا۔ دوسری بات اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ سلطان کی عمر کے بیشتر ایام جنگ کے میدان میں گزرے تھے اور اس کے متعلق یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اسے مصر اور میسور کے درمیان خشکی کے راستے سفر کی دشواریوں کا صحیح اندازہ نہ تھا۔

انگریزوں نے یہ تمام افواہیں صرف اس لیے پھیلائی تھیں کہ وہ نظام، مرہٹوں اور ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں کو زیادہ سے زیادہ پریشان کر سکیں اور ان پر یہ ثابت کر سکیں کہ سلطان ٹیپو اور نپولین کے اتحاد کے باعث تمہیں ایک بہت بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے۔

سلطان ٹیپو نے ان بے پناہ الزامات کی تردید کی۔ لیکن انگریز جنگ کا بہترین موقع کھونے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ نپولین کے خلاف مشرق، وسطیٰ یا یورپ میں سینہ سپر ہونے سے پہلے ہی اس طاقت کے ساتھ نپٹ لینا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ان کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتی تھی۔

تاہم ولزلی اپنے پلان کے مطابق فوراً جنگ شروع نہ کر سکا۔ مدراش کے گورنر نے اسے یہ اطلاع دی کہ کمپنی کی فوج چھ ماہ سے پہلے جنگ کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔ ولزلی دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر جب اسے یہ اطلاع پہنچی کہ جنرل بونا پارٹ کی افواج مصر میں داخل ہو چکی ہیں اور کچھ عرصہ ہندوستان کو اپنی ساری توجہ بحیرہ روم کی طرف مبذول رکھنی پڑے گی تو اس نے سلطان کے خلاف معاندانہ طرزِ عمل میں فوراً تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ اب وہ میسور پر حملہ کرنے کی بجائے سلطان

کے ساتھ ان متنازعہ علاقوں کے بارے میں بھی گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر رہا تھا جن پر ایسٹ انڈیا کمپنی سرنگا پٹم کے معاہدے کے خلاف قبضہ جمائے ہوئی تھی۔ اب ترکی کے خلیفہ کی طرف سے سُلطان ٹیپو کی خدمت میں اس قسم کے خطوط پیش کیے جا رہے تھے کہ اہلِ فرانس اسلام کی دشمن ہیں اس لیے کسی مسلمان حکمران کو ان کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر سلطان کو انگریزوں کے خلاف کوئی شکایت ہے تو ہم ثالثی کے لیے تیار ہیں۔



لارڈ ولزلی کے جارحانہ طرزِ عمل میں اچانک تبدیلی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اسے لاہور کی طرف زمان شاہ والیء افغانستان کی پیش قدمی کی اطلاع موصول ہو چکی تھی اور وہ یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر زمان شاہ دلی پہنچ گیا تو سارے ہندوستان کے مُسلمان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور سلطان ٹیپو ان حالات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ سلطان کے سفیر زمان شاہ کے دربار میں موجود تھے اور ان دو مسلمان حکمرانوں کے درمیان دوستانہ خط و کتابت ہو رہی تھی۔ لارڈ ولزلہ جس قدر مصر میں نپولین کی موجودگی سے پریشان تھا اس سے کہیں زیادہ لاہور کی طرف شاہ زمان کی پیش قدمی سے خائف تھا۔ ان حالات میں مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ مناسب وقت تک سلطان ٹیپو کے خلاف اپنے جارحانہ عزائم کو دستی کے دبیز پردوں میں چھپائے رکھے۔

دلی سے زمان شاہ کی توجہ ہٹانے کے لیے انگریزوں نے اپنے اپنے ہوشیار جاسوس مہدی علی خاں کی خدمت حاصل کیں۔ مہدی علی خاں ایک ایرانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بوشر میں رزیڈنٹ کے عہدے پر

فائز تھا۔ ولزلی کی ہدایات پر اس ملت فروش نے ایران کے حکمران کے دربار میں رسائی حاصل کی اور شیعہ سُنی منافرت کا سہارا لے کر اُسے زمان شاہ کے خلاف اس قدر بھڑکا کہ اس نے ایک طرف خراسان پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف ہرات کے معزول شدہ گورنر کو فوجی مدد دے کر زمان شاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ ان حالات میں زمان شاہ کو دلی کی طرف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر کے واپس جانا پڑا۔

مہدی علی خاں کی سازش نے ایک طرف ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری سہارا چھین لیا جو گزشتہ چالیس سال سے پانی پت کے میدان میں پھر کسی احمد شاہ ابدالی کا انتظار کر رہے تھے۔ دوسری طرف حیدر آباد، پونا اور اودھ کی طرح شاہِ ایران کے دربار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر و نفوذ کا راستہ کھول دیا۔ مہدی علی خاں نے ایران کے حکمران کو یہ بھی اُمید دلائی کہ انگریز زمان شاہ سے ایران کے کھوئے ہوئے علاقے واپس دلانے میں اس کی مدد کریں گے اور ایران کے حکمران نے خراسان اور ہرات پر اس وقت تک اپنا دباؤ جاری رکھا جب تک کہ انگریز ہندوستان میں اپنے ارادے پورے نہیں کر چکے تھے۔

بحیرہ روم میں نپولین کی جنگی بیڑے کی تباہی اور لاہور سے زمان شاہ کی واپسی کے بعد لارڈ ولزلی کے وہ خدشات دور ہو چکے تھے جن کے پیشِ نظر اس نے میسور پر اچانک دھاوا بولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اب وہ دلی کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے راستے کا آخری پتھر ہٹانے کے لیے بیتاب نظر آتا تھا اور سلطان کے ساتھ اس کے دوستانہ لب و لہجہ میں اچانک تبدیلی آ چکی تھی۔

زمان شاہ کی واپسی ہندوستان کی تاریخ کا ایک انتہائی المناک واقعہ ہے۔ ۱۷۶۱ میں جب احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی جنگ لڑی تھی تو مرہٹے اپنے قومی اتحاد

کے باعث ایک عظیم فوج میدان میں لے آئے تھے۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ مرہٹے ایک اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو رہے تھے اور ان میں زمان شاہ کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی۔ یہ درست ہے کہ دلی کا مظلوم اور بے بس حکمران شاہ عالم ثانی مہادجی سندھیا کے بعد اب دولت راؤ سندھیا کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھا۔ لیکن دلی پر مرہٹوں کے اقتدار کی وجہ ان کی غیر معمولی قوت نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ دلی کا نام نہاد شہنشاہ اب اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اسے اپنے تاج کا بوجھ اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

دلی کے جنوب مغرب میں راجپوتوں کی ریاستیں بھی اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں انگریز ہندوستان کے اقتدار کے سب سے بڑے دعویدار بن چکے تھے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ پر ان کا قبضہ تھا۔ اودھ کی یہ حالت تھی کہ وہاں انگریز رزیڈنٹ شجاع الدولہ کے جانشینوں سے زیادہ با اختیار تھا۔ جنوب میں راجہ ٹراونکوران کا باجگزار تھا اور ارکاٹ کا حکمران ایک ایسی لاش تھی جسے انگریزوں نے اپنی سنگینوں کا سہارا دے کر تخت پر بٹھا رکھا تھا۔ پونا اور حیدرآباد کی ریاستیں عملاً ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیادت تسلیم کر چکی تھیں۔ ان حالات میں دلی کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کیلیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے تابی ایک قدرتی بات تھی۔ انگریز اپنے راستے کے کئی پتھر ہٹا چکے تھے لیکن زمان شاہ کی پیش قدمی نے ان کے حوصلے سرد کر دیے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر انہیں زمان شاہ کے ساتھ جنگ لڑنی پڑی تو ٹیپو غیر جانبدار نہیں رہے گا اور صرف سلطان ٹیپو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر حکمران بالخصوص مرہٹے جنہیں کمپنی کے جارحانہ عزائم کے متعلق اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔ زمان شاہ کو ایک دشمن کی بجائے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو

جائیں گے۔

مصر کی طرف نپولین کی پیش قدمی اور پنجاب کی طرف زمان شاہ کی یلغار کے ایام میں برطانوی سامراج کے علمبردار اپنی تاریخ کے ایک نازک ترین دور کا سامنا کررہے تھے لیکن ان دو عظیم خطرات کے دور ہوتے ہی ہندوستان پھر ایک بار ان بھیڑیوں کی شکارگاہ بن چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی مشرق یا مغرب میں کسی نئے خطرے کا سامنا کرنے سے پہلے میسور پر دھاوا بولنے کے لیے بیتاب نظر آتی تھی۔



ایک دن تیسرے پہر میسور کا دیوان میر صادق سلطان سے ملاقات کے بعد محل سے باہر نکلا تو ڈیوڑھی کے قریب ملک جہان خان ڈھونڈیا داغ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا اور ملتجی ہو کر کہا حضور دیوان صاحب میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

کیا بات ہے؟ میر صادق نے قدرے برہم ہو کر سوال کیا۔

جناب میں صبح سے یہاں کھڑا ہوں لیکن مجھے سُلطانِ معظم کی قدم بوسی کا موقع نہیں ملا۔ آپ میری مدد کریں۔ میرے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونا اشد ضروری ہے۔

سُلطان معظم ان دنوں سخت مصروف ہیں اور میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

جناب یہ بہت ضروری ہے، خدا کے لیے میرے مدد کیجیے۔

تم میرا وقت ضائع کررہے ہو۔ میر صادق یہ کہہ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا لیکن ملک جہاں خاں نے آگے بڑھ کر پھر اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ ٹھہرے جناب میں سُلطان معظم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میسور کے خلاف کوئی خطرناک سازش

ہو رہی ہے۔

سازش؟ میر صادق نے چونک کر کہا۔

ہاں جناب میرے پاس ایک خط ہے۔

کس کا خط؟

جناب اس پر کسی کا نام نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ انگریزوں کے کسی جاسوس نے سرنگا پٹم کے کسی با اثر آدمی کے نام لکھا ہے۔

میر صادق کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ لیکن اس نے فوراً سنبھل کر کہا۔ یہاں باتیں کرنا ٹھیک نہیں تم میرے ساتھ آؤ۔

ملک جہان خاں مذبذب سا ہو کر اس کے ساتھ چل دیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ میر صادق کے ساتھ اس کے خوبصورت مکان کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ میر صادق نے ایک کشادہ میز کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بیٹھو اور اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرو؟

ملک جہان خاں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ جناب اگر آپ مجھے یہاں لانے کی بجائے سلطان کے سامنے لے جاتے تو یہ آپ کی بہت بڑی نوازش ہوتی۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ ہمیں سلطان کو کسی تاخیر کے بغیر اس طرف متوجہ کرنا چاہیے۔

میر صادق نے جواب دیا۔ سلطان معظم صبح سے کام کر رہے تھے اور اب انہیں تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔ میں شام کے وقت ان سے دوبارہ ملاقات کی کوشش کروں گا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ وہ خط تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟

جناب میں جنوب مشرق کی سرحدی چوکیوں کی حفاظت پر متعین تھا۔ دو

آدمیوں نے رات کے وقت ایک جگہ سے سرحد عبور کر کے ہمارے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ پہریداروں نے انہیں روکا۔لیکن جب انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی تو پہریداروں نے گولی چلا دی۔ایک آدمی بچ کر نکل گیا۔ لیکن دوسرا زخمی ہو کر گر پڑا۔سرحد کے محفوظ اسے بیہوشی کی حالت میں میرے پاس لے آئے۔میں نے اس کی جامہ تلاشی لی تو یہ خط برآمد ہوا۔کچھ دیر زخمی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس سے خط کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی۔وہ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کی سانس اُکھڑ گئی۔مرتے وقت اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود مطلب کی کوئی بات نہ سُن سکا۔میں یہ خط کر پہلے بنگلور کے فوجدار کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے یہ خیال آیا کہ سُلطان کی خدمت میں حاضر ہونا زیادہ بہتر ہوگا۔

میر صادق نے کہا۔میں وہ خط دیکھنا چاہتا ہوں۔

ملک جہاں خاں نے قدرے تذبذب کے بعد اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور میر اصادق کو پیش کر دیا۔میر صادق نے کاغذ کھول کر پڑھا اور اس کے چہرے پر پھر ایک بار زردی چھا گئی۔خط کا مضمون یہ تھا۔

”جناب والا: حائل ہذا ایک قابلِ اعتماد آدمی ہے اور وہ آپ سے تمام ضروری باتیں زبانی عرض کر دے گا۔آپ نے ہمیں جو ضروری اطلاعات فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچیں۔اب حالات ایسے ہیں کہ آپ کی طرف سے ذرا سی تاخیر بھی ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہو سکتی ہے۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے وعدوں کا پاس کیا تو آپ کے تمام مطالبات پورے کیے جائیں گے۔

اب آپ کو خط لکھنے کی بجائے زبانی پیغام پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کو میرا اسلام پہنچا دیجیے۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا دوست‘‘

میر صادق نے کاغذ جہاں خاں کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ یہ خط میرے لیے ایک مُعما ہے۔ بہر حال یہ معاملہ سُلطانِ معظم کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ میں داروغہ کو پیغام بھیجتا ہوں لیکن آج وہ اس قدر مصروف ہیں کہ شاید مجھے بھی دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ سُلطان معظم کے ساتھ آج کی بجائے کل ملاقات کی کوشش کی جائے۔

’’لیکن دیوان صاحب یہ مسئلہ بہت نازک ہے اور میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میر صادق نے کہا۔ میں نے تمھیں بتایا ہے کہ آج سلطانِ معظم بہت مصروف ہیں اور میں اگر اسی وقت دوبارہ واپس جا کر ان سے ملاقات کے لیے اصرار کردوں تو میرے لیے یہ ضروری ہے کہ میں اس خط کے صحیح ہونے کے متعلق کوئی ناقابلِ تردید ثبوت پیش کرسکوں ورنہ سلطانِ معظم یہ محسوس کریں گے کہ میں نے انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا ہے۔

جہان خاں نے کہا۔ دیوان صاحب معاف کیجیے میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

میر صادق نے جواب دیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ خط ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ دشمن نے ہمیں پریشان کرنے کے لیے شرارت کی ہو۔ اس میں نہ تو لکھنے والے کا نام ہے اور نہ ہی مکتوب الیہ کی کوئی نشان دہی کی گئی ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ سُلطان معظم مجھے بیوقوف خیال کریں۔ کل بھی سلطان معظم کے

ساتھ تمہاری ملاقات کا بندوبست کرتے وقت میں اپنی طرف سے اس خط کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی ذمہ دار نہیں قبول کروں گا۔میں یہ صرف یہ کوشش کروں گا کہ تمہیں ملاقات کے لیے وقت مل جائے۔لیکن اگر تم اسی وقت سُلطانِ معظم سے ملنا ضروری سمجھتے ہو تو یہ بہتر ہو گا کہ تم پورنیا کے پاس چلے جاؤ۔سلطان معظم نے انہیں کسی مسئلے پر کوئی مشورہ دینے کے لیے سہ پہر کے وقت طلب کیا ہے۔وہ اگر سلطان سے یہ کہہ دیں کہ تم کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے آئے ہو تو ممکن ہے تمہیں آج ہی ملاقات کا وقت مل جائے۔اگر تم کہو تو میں پورنیا کو اپنی طرف سے ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں۔

ملک جہاں خاں نے پریشان ہو کر کہا۔میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن میں پورنیا سے اس خط کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔

تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان معظم کے دربار میں پورنیا کا اثر و رسوخ میری نسبت کہیں زیادہ ہے۔

نہیں جناب آپ پورنیا سے اس خط کے متعلق کوئی ذکر نہ کریں میں کل تک انتظار کر سکتا ہوں۔

میر صادق نے غور سے جہاں خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم پورنیا کو اعتماد میں لینے سے گھبراتے ہو۔

جناب میرے گھبراہٹ بلاوجہ نہیں۔مجھے ڈر ہے کہ اگر پورنیان کو اس خط کا پتہ چل گیا تو اس کی کوشش یہی ہو گی کہ۔۔۔

جہان خاں اپنا فقرہ پورا کیے بغیر تذبذب اور پریشان کی حالت میں میر صادق کی طرف دیکھنے لگا۔

میر صادق نے ذرا رُعب دار آواز میں کہا۔تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

''جناب میرا خیال ہے کہ مرتے وقت دُشمن کے جاسوس نے پورنیا کا نام لینے کی کوشش کی تھی۔میر صادق کے چہرے پر پہلی بار اطمینان کی جھلک دکھائی دی اور اس نے کہا۔سُلطان کے ایک وزیر پر یہ الزام بہت سنگین ہے اوران کے سامنے کوئی ایسی بات کہنے کی بجائے تمہیں اپنی جان کے متعلق اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ تمہیں یقین ہے کہ جاسوس نے دیوان پورنیا کا نام لیا تھا؟''

''جناب اگر مجھے یقین ہوتا تو میں کسی سے مشورہ کیے بغیر اس کا سر کاٹ کر سُلطان کے حضور میں پیش کر دیتا۔میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے اچھی طرح پورنیا کا نام سُنا تھا لیکن مرتے وقت جاسوس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ پورنیا کا نام لے رہا ہے۔ممکن ہے کہ یہ سراسر میرا وہم ہو۔

میر صادق نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔میں ایک غیر ذمہ دار آدمی کی باتوں پر توجہ دینے کی غلطی کر چکا ہوں لیکن میں کسی مزید حماقت کے لیے تیار نہیں ۔میں تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں کل سُلطان معظم کے ساتھ تمہاری ملاقات کا انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔اگر تم کل صبح محل کے دروازے پر پہنچ جاؤ تو میں یہ کوشش کروں گا کہ ملاقات کے لیے تمہاری درخواست سلطان کی خدمت میں پہنچ جائے۔اس کے بعد مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔میں بھی یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ تم نے مجھ سے اس خط کا ذکر کیا ہے۔تم ایک سپاہی ہو اور ممکن ہے کہ تمہارے خلوص سے متاثر ہو کر سُلطانِ معظم تمہاری کوئی غلطی نظر انداز کر دیں ہم میں ایک وزیر ہوں۔

جناب آپ مطمئن رہیں میں سلطان سے آپ کا ذکر نہیں کروں گا۔مجھے

افسوس ہے کہ غازی بابا سرنگا پٹم سے باہر ہیں ورنہ میں آپ کو پریشان نہ کرتا۔ میں کل شاہی محل کے دروازے پر آپ کا انتظار کروں گا۔

تم کہاں ٹھہرو گے؟

جناب میں سُلطان کی فوج کے ایک افسر کے ہاں قیام کروں گا۔

اس افسر کا نام کیا ہے؟

مُراد علی! ملک جہاں خاں یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

میر صادق نے کہا۔تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے صبح سے کھانا نہیں کھایا ہے؟

جناب میں نے کل شام سے کھانا نہیں کھایا ہے۔رات بھر میں نے سفر کیا ہے اور صبح سے شاہی محل کی طواف کر رہا ہوں۔

تو بیٹھ جاؤ میں تمہارے لیے کھانا بھیجتا ہوں۔

نہیں جناب آپ تکلیف نہ کریں۔

کیسی تکلیف، سُلطان کے ایک وفادار سپاہی کی خدمت میرا فرض ہے۔میر صادق یہ کہہ کر اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد میر صادق کا ایک نوکر ملک جہان خاں کو کھانا کھلا رہا تھا اور اس کے دو مُلازم ضروری پیغامات لے کر قمر الدین اور پورنیا کی قیام گاہوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

کھانے کے چند لقمے حلق میں اتارتے ہی ملک جہان خاں اپنے دماغ میں ایک غنودگی سی محسوس کرنے لگا۔پہلے اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ غنودگی گئی گھنٹوں کی تھکاوٹ اور بھوک کا نتیجہ ہے۔لیکن جب اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی تو وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔میر صادق کے نوکر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے

ہوئے کہا۔ کیا بات ہے جناب آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں؟

میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ملک جہان خاں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن دروازے کی طرف چند قدم اٹھانے کے بعد وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

نوکر نے جلدی سے اس کی جیب سے کاغذ نکالا اور باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد میر صادق مکان کے ایک کشادہ کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا۔ میر قمر الدین داخل ہوا اور اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ میں آپ کا رُقعہ دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ ملک جہان خاں کہاں ہے؟

دوسرے کمرے میں بے ہوش پڑا ہے۔ آپ پہلے یہ خط پڑھ لیں۔ پھر میں آپ سے تمام واقعات بیان کروں گا۔

میر قمر الدین نے میر صادق کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھا اور پھر سراسیمگی حالت میں اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ یہ خط جہان خاں کے ہاتھ کیسے آ گیا؟

جہاں خاں کے ساتھیوں نے آپ کے ایلچی کو واپسی پر سرحد عبور کرتے وقت قتل کر دیا تھا۔ میر قمر الدین کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے دوبارہ خط کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ اس خط کی وجہ ہمارے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو گیا ہے؟

ایلچی نے مرتے وقت ہمارے ایک ساتھی کا نام ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

اور وہ کون تھا؟

پورنیا۔ میں نے اسے بھی پیغام بھیجا ہے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اب ملک جہان خاں کے متعلق کوئی مناسب بندوبست کرنا آپ کا کام ہے۔ میں نے اسے کھانے میں جو دوائی کھلائی ہے اس کا نشہ دو تین گھنٹے تک زائل ہو جائے گا۔

میرے خیال میں ہمارے لیے اب آسان ترین بات یہ ہے کہ ہم اسے قتل کر دیں۔

نہیں۔ ہمارے لیے آسان ترین بات یہ ہے کہ ہم اسے پورنیا کے حوالے کر دیں۔

آپ کا خیال ہے کہ پورنیا اس کے قتل کا مشورہ نہیں دے گا؟

ضرور دے گا لیکن میں اسے قتل کرنے کی بجائے قید کرنے کے حق میں ہوں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہمیں اس بات کی تسلی نہ ہو جائے کہ اس کا اور کوئی ساتھی ان واقعات سے باخبر نہیں۔ آپ آج ہی چند ہوشیار آدمیوں کو سرحد پر بھیج دیں جو جہان خاں کے ساتھیوں سے یہ پتہ لگائیں کہ وہ اس مسئلے کے متعلق کہاں تک باخبر ہیں۔ پھر اس کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے گا۔ سردست ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ ایک گمنام قیدی کی حیثیت میں قید خانے کے اندر پڑا ہے اور سلطان سے اس کی ملاقات نہ ہو سکے۔ اگر لارڈ ولزلی اور میر نظام علی کے وعدے درست ہیں تو چند ماہ بعد ملک جہاں خاں جیسے لوگ ہمارے لیے کسی خطرے کا باعث ہوں گے۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا خطرہ رہتا تھا کہ کہیں پورنیا ہمارے ساتھ دھوکا نہ کرے۔ لیکن اب یہ خط ہمارے ہاتھ میں ایک تلوار ہو گا اور پورنیا کم از کم اپنی سلامتی کے خوف سے ہمارے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہو گا۔

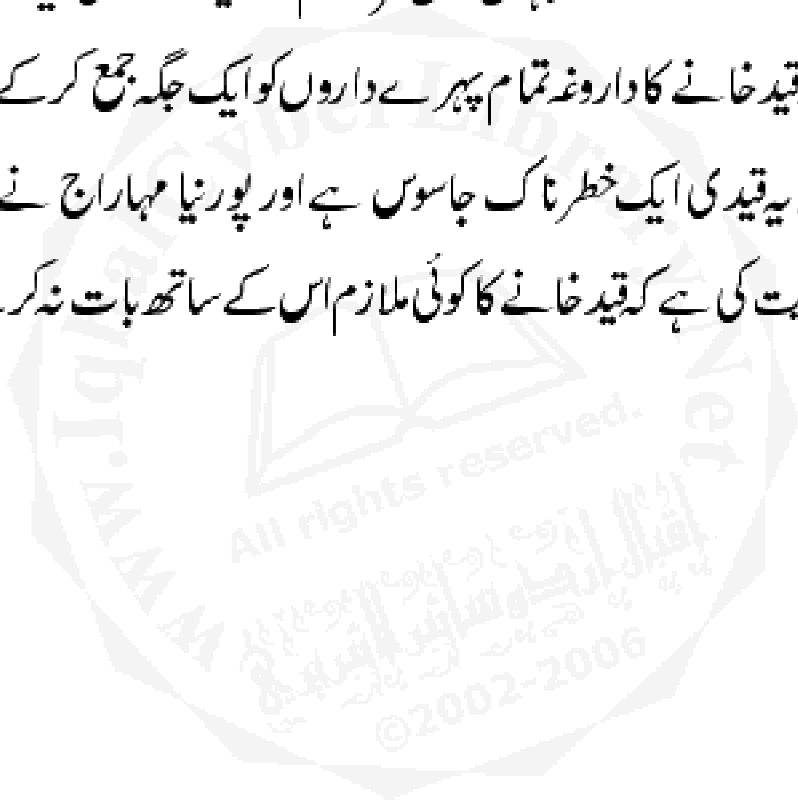
باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میر قمر الدین نے کہا۔ شاید ہو آ رہا ہے۔

پورنیا ہانپتا کانپتا کمرے میں داخل ہوا۔ میر صادق نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

آیئے جناب یہ آپ کے خوش قسمتی تھی کہ ملک جہان خاں سلطان سے ملاقات کی

بجائے میرے قبضے میں آگیا تھا۔ آپ کا ایلچی واپسی پر سرحد عبور کرتے وقت قتل ہو گیا تھا اور اس نے تمام واقعات ملک جہان خاں پر ظاہر کر دیے تھے۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔ ملک جہان خاں دوسرے کمرے میں بیہوش پڑا ہوا ہے اب یہ ضروری ہے کہ آپ کچھ عرصہ اسے اپنی تحویل میں رکھیں۔

رات کے وقت ملک جہان خاں سرنگا پٹم کے قید خانے کی ایک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا اور قید خانے کا داروغہ تمام پہرے داروں کو ایک جگہ جمع کر کے ہدایت دے رہا تھا کہ یہ قیدی ایک خطرناک جاسوس ہے اور پورنیا مہاراج نے بڑی سختی کے ساتھ ہدایت کی ہے کہ قید خانے کا کوئی ملازم اس کے ساتھ بات نہ کرے۔



پچیسواں باب

۱۷۹۹ء کے آغاز میں انگریزوں کی جنگی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ جنرل ہیرس کی کمان میں اکیس ہزار سپاہی کوچ کے لیے حکم انتظار کر رہے تھے۔ کمپنی کی ایک اور فوج جس کی تعداد قریباً سات ہزار تھی جنرل اسٹورٹ کی کمان میں کنانور میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی حیدر آباد سے سولہ ہزار آزمودہ کار سپاہی کرنل ولزلی کی قیادت میں آمبور کا رُخ کر رہے تھے اس کے علاوہ کرنل براؤن اور کرنل ریڈ کے ماتحت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک اور فوج ترچنا پلی سے کوچ کی تیاری کر رہی تھی۔

یہ بے پناہ تیاریاں اس حکمران کے خلاف تھیں جو گزشتہ جنگ میں اپنی آدھی سلطنت کھو بیٹھنے کے باوجود انگریزوں کو ہندوستان کا سب سے بڑا دفاعی حصار دکھائی دیتا تھا۔ چھ سال کے بعد عرصے میں شیرِ میسور کے زخم مندمل ہو چکے تھے اور نگریز بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہے تھے۔ سُلطان ٹیپو کی زندگی کے ہر سانس کے ساتھ ان کے مستقبل کے لیے ایک نیا خطرہ پیدا ہوتا جا رہا ہے۔

اے کرنل آرتھر ولزلی، لارڈ ولزلی کا چھوٹا بھائی جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن کے نام سے مشہور ہوا اور جس نے انگریزی سپاہ کے سالار کی حیثیت میں واٹر لو کی جنگ میں نپولین بونا پارٹ کو شکست دی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کی افواج کی نقل و حرکت کے بعد سلطان کو ان کے جارحانہ عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ شیرِ میسور پھر ایک بار اپنے مُٹھی بھر سر فروشوں کے ساتھ گدھوں اور بھیڑیوں کی لاتعداد افواج کے سامنے کھڑا تھا۔ مغرب کے جارحیت کے مقابلے میں عالم اسلام کو متحدہ منظم کرنے کے لیے اس کی سر توڑ کوشش ناکام ہو چکی تھیں۔ ترکی میں عالم اسلام کا سب سے بڑا محافظ سُلطان سلیم

انگریزوں کا بے بس دُعا گو بن چکا تھا۔ ایران میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ زمان شاہ والیءِ افغانستان ابھی تک اپنے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا اور ہندوستان میں جن طالع آزماؤں نے سلطنتِ مُغلیہ کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کی مسندیں سجائی تھیں ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اس بدنصیب ملک کے مستقبل کے متعلق سوچ سکتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی حلیفوں کی حالت ان کُتوں سے بدتر تھی جو خشک ہڈیوں میں حصہ دار بننے کے لیے شکاریوں کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔

ہندوستان کے سیاست میں اگر کوئی انقلاب آیا تھا کہ وہ یہ تھا کہ مرہٹے جنہوں نے کئی بار سلطان کے خلاف انگریزوں کے ساتھ دیا تھا اب اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس کر رہے تھے۔ مرہٹہ سرداروں میں سُلطان ٹیپو کا سب سے بڑا طرف دار نکو جی ہلکر وفات پا چکا تھا۔ تاہم اس کا جانشین جسونت راؤ اپنے پیشرو کی طرح سلطان ٹیپو کی اجنبی اقتدار کے راستے کی سب سے بڑی دیوار سمجھتا تھا۔ اسی طرح مہادے جی سندھیا کا جانشین دولت راؤ سندھیا بھی بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا تھا کہ سُلطان ٹیپو کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا دُوسرا مرہٹوں پر ہوگا۔ پونا کے دربار میں سندھیا کے اثر و رسوخ نے سُلطان ٹیپو کے لیے اُمید افزا حالات پیدا کر لیے تھے ار پیشوا ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے سلطان ٹیپو کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کر چکا تھا۔ لیکن اپنی کمزوری اور متلون مزاجی کے باعث وہ اپنے ارادوں کو عمل جامہ پہنانے سے قاصر رہا اور سُلطان ٹیپو کی زیادہ سے زیادہ کامیابی یہ تھی کہ مرہٹے اس جنگ میں غیر جانب دار ہو گئے تھے۔



ایک روز آدھی رات کے وقت انور علی اور منیرہ چتل ڈرگ کے قلعے کی چار دیواری کے اندر کشادہ مکان کے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

کون ہے؟ انور علی نے گہری نیند سے بیدار ہو کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

باہر سے کسی نے مانوس آواز سنائی دی۔ میں مُراد علی ہوں بھائی جان!

انور علی نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ مراد علی کے ساتھ قلعے کا ایک پہرے دار مشعل اٹھائے اور کھڑا تھا۔ انور علی اپنے چھوٹے بھائی سے بغل گیر ہو کر پوچھا۔ تم۔۔ اس قت خیر تو ہے؟

پریشانی کی کوئی بات نہیں بھائی جان میں صرف آپ کو دیکھنے آیا ہوں۔ بھابھی جان کیسی ہیں؟

وہ بالکل ٹھیک ہیں آؤ۔ انور علی نے یہ کہہ کر سپاہی کے ہاتھ سے مشعل پکڑ لی۔ اور مُراد علی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مشعل کی لو سے کمرے کا چراغ جلایا اور مشعل باہر برآمدے میں رکھنے کے بعد واپس آ کر منیرہ کو آواز دی۔ منیرہ منیرہ! مراد علی آیا ہے!

برابر کے کمرے سے منیرہ کی آواز سُنائی دی۔ کون آیا ہے؟

مُراد آیا ہے منیرہ!

مراد! منیرہ بھاگتی ہوئی ان کے کمرے میں داخل ہوئی اور مسرت اور اضطراب کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ مراد علی کی طرف دیکھنے لگی۔

مُراد علی نے سلام کرنے کے بعد کہا۔ بھابی جان گھبرانے کی کوئی بات نہیں

میں آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔

انور علی نے کہا۔ مراد تم کسی مہم پر جا رہے ہو۔ بیٹھ جاؤ! منیرہ تم نوکر کو جگا کر اس کے لیے کھانے کا انتظام کرو۔

بھائی جان میں کھانا کھا چکا ہوں۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں تھوڑی دیر آپ سے باتیں کرنے کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔

تم کہاں جا رہے ہو؟ انور علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

بھائی جان میں زمان شاہ والی افغانستان کے پاس سُلطان معظم کا ایک ضروری پیغام لے کر جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی منگلور کا بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہوں گے اور میں کندہ پور سے ان کیساتھ شامل ہو جاؤں گا۔ سندھ کے ساحل پر پہنچ کر ہم خشکی کے راستے سفر کریں گے۔ مجھے یہ مہم غازی بابا اور سید غفار کی سفارش پر سونپی گئی ہے۔ میں نے سلطانِ معظم کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ اگر مجھے جانے سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت دی جائے تو منگلور کے جہاز سے پہلے کندہ پور پہنچ جاؤں گا۔ سُلطان معظم نے فرمایا تھا کہ ہم عنقریب تمہارے بھائی کو چتل ڈرگ کی بجائے سرنگا پٹم میں ایک اہم ذمہ داری سونپنے والے ہیں۔ سید غفار نے بھی مجھے بتایا تھا کہ سرنگا پٹم میں نائب فوجدار کے عہدہ کے لیے ایک قابلِ اعتماد اور تجربہ کار افسر کی ضرورت ہے اس لیے آپ کو ایک ہفتہ کے اندر اندر واپس بلا لیا جائے گا۔

انور علی نے کہا۔ اب زمان شاہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری اُمید ہے۔ سرنگا پٹم کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ولزلی سلطان کے ساتھ آخری جنگ لڑنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اسے صرف زمان شاہ کے حملہ کے خوف نے جنگ سے باز

رہنے پر مجبور کردیا تھا۔

مُرادعلی نے کہا۔ بھائی جان ان دنوں سُلطان کے مان لارڈ ولزلی کے خطوط کا لب ولہجہ میسور کے خلاف اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر پچھلی مرتبہ زمان شاہ لاہور سے واپس نہ چلا جاتا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرزِ عمل میں یہ تبدیلی نہ آتی۔ اب افغانستان سے ہمارے سفیروں نے یہ اطلاع بھیجی ہے کہ زمان شاہ پھر لاہور کا رُخ کر رہے ہیں اور اس مرتبہ دلی پہنچے بغیر دم نہیں لیں گے۔ خدا کرے یہ اطلاع درُست ہو۔ اگر زمان شاہ لاہور پہنچ گئے تو میری یہ مہم بہت مختصر ہوگی۔ بصورت دیگر مجھے افغانستان جانا پڑے گا اور وہاں سے قلات کے راستے سے واپس آؤں گا۔

انور علی نے کہا۔ مُرادسلطان نے تمھیں ایک نہایت اہم مہم سونپی ہے اور میں تمھاری کامیابی کے لیے دعا کرتی ہوں۔ کاش زمان شاہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک اور احمد شاہ ابدالی بن سکے۔ تم تھکے ہوئے ہو تھوڑی دیر آرام کرلو۔ اگر تمھارا فوراً جانا ضروری ہے تو میں علی الصباح تمھیں جگادوں گا۔

مرادعلی نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر انور علی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ بھائی جان یہ لیجیے میں اس کی حفاظت نہیں کرسکتا۔

منیرہ نے پوچھا۔ اس میں کیا ہے؟

انور علی نے تھیلی پکڑ کر منیرہ کے ہاتھ میں رکھ دی اور کہا۔ یہ بیش قیمتی جواہرات ہیں۔ انھیں سنبھال کر رکھو۔

تھوڑی دیر بعد مرادعلی ایک کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا صبح کی اذان کے ساتھ انور علی نے اسے جگایا اور کہا۔ مُراد اُٹھو اب نماز کا وقت ہے۔ میں نے تمھارے لیے تازہ دم گھوڑے پر زین ڈلوادی ہے اور تمھاری بھابی ناشتہ تیار کرچکی

ہیں۔

مُرادعلی نے اپنے بھائی کے ساتھ قلعے کی مسجد میں نماز ادا کی اور واپس آ کر ناشتے پر بیٹھ گیا۔ انورعلی نے اس کے ساتھ چند نوالے کھائے لیکن منیرہ مغموم صورت بنائے ان کے قریب بیٹھی رہی، مُرادعلی نے کہا بھابی جان آپ کچھ نہیں کھائیں گی؟

مجھے اس وقت بھوک نہیں۔ منیرہ نے بڑی مرجھائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ میں ذرا دیر سے ناشتہ کیا کرتی ہوں۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ مُراد تم نے گزشتہ خط میں اپنی چچی کے ہاں جانے کا خیال ظاہر کیا تھا۔

ہاں بھابی جان انہیں دیکھے بہت دیر ہو گئی تھی اور میرا ارادہ تھا کہ چند دن کے لیے وہاں ہو آؤں۔ لیکن اب یہ کام وہاں جانے سے زیادہ ضروری ہے۔

تم نے انہیں کوئی خط بھی نہیں بھیجا؟

سرنگا پٹم سے روانہ ہوتے وقت میں نے انہیں ایک خط بھیجا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ میں اپنی مہم سے فارغ ہوتے ہی آپ کے پاس آؤں گا۔

ناشتہ ختم کرنے کے بعد انور اور مراد اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مُرادعلی نے کہا۔ بھابی جان اب مجھے اجازت دیجیے۔

منیرہ نے کہا۔ مُراد جلد واپس آنے کی کوشش کرنا!

بھابی جان میں انشاءاللہ بہت جلد آ جاؤں گا۔ آپ دُعا کریں کہ مجھے اپنی مہم میں کامیابی ہو۔

انورعلی مسکرایا۔ منیرہ ہر نماز کے ساتھ تمہارے لیے دعا کیا کرتی ہے۔

مُرادعلی، منیرہ کو خدا حافظ کہہ کر انورعلی کے ساتھ مکان سے باہر نکلا قلعے کے

دروازے پر پہریدار اس کے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ مُراد علی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن انور علی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کلے سے لگالیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ مُراد خدا حافظ!

خدا حافظ بھائی جان! مراد علی پہریدار کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ کر سوار ہو گیا۔ اس نے گھوڑا موڑ کر ایڑ لگادی۔ لیکن انور علی نے جو بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اچانک آگے بڑھ کر چلایا۔ ٹھہرو میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔

مراد علی نے جلدی سے گھوڑا روکا اور مڑ کر بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ انور علی نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ مُراد میں ابھی تک ایک اہم فرض پورا کرنے سے قاصر رہا ہوں اب میں پہلی فرصت میں چچا اکبر خاں کے گھر جاؤں گا۔ چچی جان کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے خاندانوں کے درمیان جو رشتہ چچا اکبر خاں کی زندگی میں قائم ہوا تھا وہ اُن کی موت کے بعد ختم نہیں ہوا۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو؟

ہاں بھائی جان! آپ ضرور جائیں۔ اگر آپ کو موقع نہ ملے تو کم از کم کسی نوکر کو بھیج کر ان کی خیریت معلوم کر لیں۔

بہت اچھا خدا حافظ!

مُراد علی نے کہا۔ بھائی جان موجودہ دور میں ہم اپنے مستقبل کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے لیکن اگر میں کسی وجہ سے واپس نہ آسکوں تو مجھے یقین ہے کہ آپ ثمینہ اور اس کی والدہ کا خیال رکھیں گے۔ پھر اس نے انور علی کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگادی۔



مارچ ۱۷۹۹ کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کی افواج نے مختلف محاذوں سے میسور پر حملہ کر دیا۔ دشمن کے مقابلے میں میسور کی جنگی وسائل بہت کم تھے۔ تاہم امن کے زمانے میں سلطان ٹیپو نے جو دفاعی انتظامات کیے تھے ان کے پیشِ نظر اسے اس بات کا پورا اطمینان تھا کہ دشمن کی افواج اپنے لامحدود جنگی وسائل کے باوجود موسمِ برسات سے پہلے سرنگاپٹم تک نہیں پہنچ سکیں گی اور موسم برسات کی طغیانیاں سلطنت خداداد کے لیے پھر ایک بار نا قابلِ تسخیر حلیف ثابت ہوں گی۔ لیکن لارڈ ولزلی اپنی افواج کو پیش قدمی کا حکم دینے سے پہلے اس بات کا پورا اطمینان کر چکا تھا کہ یہ جنگ چند ہفتوں کے اندر ختم ہو جائے گی اور اسے لارڈ کارنوالس کی طرح موسمِ برسات میں سرنگاپٹم کی دیواروں کے سامنے تباہی اور بربادی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ولزلی کو اپنے اور میر نظام علی کے لاتعداد لشکر کی جرات و ہمت سے زیادہ ان غداروں اور ملت فروشوں کی اعانت پر بھروسہ جو سرنگاپٹم میں بیٹھ کر سلطان کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔

سلطنتِ خداداد کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہاں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی جو ایک عظیم سلطنت کی تعمیر میں حیدر علی اور سلطان ٹیپو جیسے اولو العزم حکمرانوں کی امنگوں کا ساتھ دے سکتے تھے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے میسور کے حکمرانوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے مسلمانوں کا بہترین جوہر جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرنگاٹم میں ہر ذہین اور باہمت انسان کے لیے کامیابی اور ترقی کے دروازے کھلے تھے۔ حیدر علی اور اس کے بعد سلطان ٹیپو کی فیاضی کے باعث جہاں زمانے کے بہترین علماء سپاہی، سیاست دان، تاجر اور صناع میسور میں جمع ہو

گئے تھے وہاں ایسے ابنائے وت کی بھی کمی نہ تھی جو صرف سلطنتِ خداداد کی خوشحالی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ جب تک میسور کے حالات سازگار رہے انہوں نے اپنا مستقبل سلطان ٹیپو کے ساتھ وابستہ رکھا۔ لیکن جب ان طالع آزماؤں نے یہ دیکھا کہ سلطان ٹیپو تن تنہا زیادہ عرصہ کے لیے ساری دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا تو انہوں نے اپنا مستقبل انگریزوں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ میسور کی تیسری جنگ کے بعد ہی یہ لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ سلطنتِ خداداد کی بنیادیں ہل چکی ہیں اور اب یہ عظیم عمارت زیادہ عرصہ وقت کی آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ اگر نپولین مشرق کا رُخ کرتا یا زمان شاہ، احمد شاہ ابدالی کی طرح اسلام کی محبت سے سرشار ہو کر پانی پت تک پہنچ جاتا تو یہ لوگ شاید سلطان کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کرتے۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ یہ طالع آزما اپنی عزت اور اقتدار کے لیے سلطان کا ساتھ دے سکتے تھے لیکن عزت کی موت میں انہیں اس کا ساتھ بننا گوارا نہ تھا۔

چنانچہ دشمن کی پیش قدمی سے قبل غدار وزیروں اور نمک حرام افسروں کا ایک منظم گروہ انہیں تمام ضروری معلومات فراہم کر چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کی افواج کے سپہ سالاروں کو یہ معلوم تھا کہ سرنگا پٹم کی طرف ان کے لیے کون سے راستے محفوظ اور کون سے غیر محفوظ ہیں۔ وہ کون سے قلعے اور چوکیاں ہیں جن کے محافظ وقت آنے پر سُلطان سے غداری کر کے ان کے ساتھ مل جائیں گے۔ گزشتہ جنگوں میں انگریز اور ان کے حلیف مختلف محاذوں پر سلطان ٹیپو کے طوفانی دستوں کی نقل و حرکت سے بے خبر رہتے تھے۔ لیکن اب انہیں ہر آن اس قسم کی اطلاعات مل رہی تھیں کہ آج سلطان کا پڑاؤ فلاں جگہ ہے۔ اب وہ فلاں محاذ سے پیچھے ہٹنے اور فلاں محاذ پر جوابی حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ فلاں قلعے یا فوج

کے افسر خریدے جا چکے ہیں۔ اور وہ آپ کا راستہ نہیں روکیں گے۔ فلاں فلاں دستوں کے افسر سلطان کے وفادار ہیں اور آخری دم تک لڑتے رہیں گے اور دشمن ان اطلاعات کی روشنی میں اپنے جنگی نقشے تیار کر رہا تھا۔

مارچ کے پہلے ہفتے سلطان ٹیپو پر یا پٹم کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ جنرل اسٹورٹ کے ہراول دستے اس کی زد میں آ چکے تھے اور سلطان کے اچانک حملے کے باعث ان کی مکمل تباہی یقینی تھی لیکن کسی غدار نے جنرل اسٹورٹ کو سلطان کے عزائم سے بروقت خبردار کر دیا اور اس نے فوراً کمک بھیج کر اپنی فوج کو تباہی سے بچا لیا۔ اس کے باوجود چند خونریز معرکوں میں سلطان کا پلہ بھاری رہا لیکن دوسرے محاذ پر جنرل ہیرس کی پیش قدمی کے باعث سلطان کو پر یا پٹم سے کوچ کرنا پڑا۔

سلطان ٹیپو پر یا پٹم سے سرنگا پٹم واپس پہنچ کر جنرل ہیرس کے خلاف جوابی حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا اور میر معین الدین اور پورنیا کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ سرنگا پٹم کے راستے میں جنرل ہیرس کے لشکر کو الجھانے کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور جنرل ہیرس کی لاتعداد افواج کسی دِقت کے بغیر ملولی کے قریب پہنچ گئیں۔ میسور کے لیے پورنیا اور معین الدین کی اس غداری کے نتائج نہایت خطرناک ثابت ہوئے اگر وہ ذرا بھی نیک نیتی کا ثبوت دیتے تو جنرل ہیرس کا چند دنوں کے اندر طولی تک پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔ جنرل ہیرس کی فوج جس شان سے سفر کر رہی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ساٹھ ہزار بیل رسد اور جنگی سامان کی گاڑیوں میں جُتے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں اونٹوں پر بھی سامان لدا ہوا تھا اور کئی ہاتھی خالی توپیں کھینچ رہے تھے۔

اسی طرح میر نظام علی کی فوج کے ساتھ ہاتھیوں اور اونٹوں کے علاوہ چھتیس ہزار بیل تھے۔ بنجاروں اور خیمہ برداروں کی تعداد لڑنے والے سپاہیوں سے پانچ گنا زیادہ تھی۔ پانی پت کی جنگ کے بعد ہندوستان کی کسی شاہراہ پر اتنا بڑا قافلہ نہیں دیکھا گیا تھا۔ قریباً ایک لاکھ بیلوں اونٹوں اور سینکڑوں ہاتھیوں کو چارا مہیا کرنا معمولی بات نہ تھی۔ منگلور تک پہنچتے پہنچتے اس قافلے کی حالت یہ تھی کہ راستے کی ہر منزل پر سینکڑوں مویشی چارے کی قلت کے باعث ہلاک ہو رہے تھے اور جنرل ہیرس مجبوری کی حالت میں اپنا بہت سا سامان راستے میں ضائع کر چکا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور حیدر آباد کے لشکر کی یہ پیش قدمی اتنی غیر منظم اور ان کی رفتار اس قدر سُست تھی کہ وہ مشکل پانچ سات میل فی دن کے حساب سے راستہ طے کر رہے تھے۔ انہیں اگر کسی بات کا اطمینان تھا تو یہ کہ سلطان نے اپنے جن جرنیلوں کو ان کا راستہ روکنے کا حکم دیا تھا وہ دشمن کے قریب آنے کی بجائے ان سے چند منازل دور رہنا پسند کرتے تھے۔ اگر میر معین الدین اور پورنیا غداری نہ کرتے تو ان کی معمولی مزاحمت بھی دشمن کے تمام منصوبے خاک میں ملا سکتی تھی جنرل ہیرس کا لشکر ایک منظم فوج کی بجائے دیہاتی برات معلوم ہوتی تھی۔ راستے کی دُشوار گزار گھاٹیوں اور ناہموار راستوں پر بے شمار مقامات ایسے تھے جہاں میسور کے چھاپہ مار سواروں کے اچانک حملے دشمن کی لیے تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ راستے میں جنرل ہیرس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنی ہزاروں بیل گاڑیوں اور ان پر لدے ہوئے ساز و سامان کی حفاظت تھا۔ اگر پورنیا اور معین الدین جنرل ہیرس کا راستہ روک سکتے تو بھی جنرل ہیرس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بے پناہ ساز و سامان سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں کی کئی میل لمبی قطار کے ساتھ اس قدر اطمینان سے سفر کر

سکتا۔ آٹھ سال قبل جب لارڈ کارنوالس نے سرنگاپٹم پر چڑھائی کی تھی تو اپنے بھاری سازوسامان کے باعث اسے ایک عبرتناک تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اے لارڈ ولزلی کے قول کے مطابق منگلور تک پہنچتے پہنچتے باربرداری کے اتنے جانور ہلاک ہوچکے تھے کہ انگریزی فوج کے لیے اپنی پیش قدمی ملتوی کردینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اور اگر اسی مستعدی کے ساتھ اب جنرل ہیرس کا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی تو اسے دنوں کا پروگرام مہینوں پر ملتوی کرنے کے لیے مجبور کیا جاسکتا تھا۔

یہ درست ہے کہ ۱۷۹۹ء میں سلطان کے فوجی وسائل وہ نہ تھے جو آٹھ سال قبل تھے لیکن مرہٹوں کی غیر جانب داری کے باعث سلطان کی رہی سہی طاقت اس قابل ضرور تھی کہ وہ پوری خوداعتمادی کے ساتھ نظام اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرسکتا۔ کم از کم ۱۷۹۹ء کے موسمِ برسات تک جنرل ہیرس کی افواج کو سرنگاپٹم سے دور رکھنا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی اور اس کے بعد جنگ کی طوالت سلطان کی نسبت لارڈ ولزلی اور میر نظام علی کے لیے زیادہ خطرناک ہوسکتی تھی۔ لیکن اب سلطنتِ خداداد کے لیے اندرونی غدار بیرونی حملوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہورہے تھے۔

ان حالات میں سلطان اپنے طوفانی دستوں کے ساتھ سرنگاپٹم سے نکلا اور اس نے ملولی کے قریب جنرل ہیرس اپنے راستے کے دشوار منازل طے کرچکا تھا۔ سُلطان نے ملولی کے قریب پے درپے حملے کرکے دشمن کے سینکڑوں سپاہی موت کے گھاٹ اُتار دیے لیکن جنرل ہیرس کی لاتعداد فوج کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ پھر جب اسے یہ اطلاع ملی کی مغرب کی طرف سے بمبئی کی افواج سرنگاپٹم کی طرف

بڑھ رہی ہیں تو اسے ملولی کے آس پاس فیصلہ کن جنگ لڑنے کا ارادہ ترک کر کے پیچھے ہٹنا پڑا۔ جنرل ہیرس نے اپنے عقب میں سلطان کے حملوں کا خطرہ محسوس کر کے براہِ راست سرنگا پٹم کی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائے وہ طویل راستہ اختیار کیا جہاں میسور کے غداروں کے اثر و رسوخ کے باعث اسے کسی مزاحمت کی توقع نہ تھی اور قلعے کے شمال کی طرف دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا اب سرنگا پٹم کے جزیرے اور جنرل ہیرس کی فوجی کیمپ کے درمیان کاویری کے علاوہ سلطان کی بیرونی چوکیاں حائل تھیں۔ جن کے توپ خانے انگریزوں کی سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔ جنرل ہیرس نے چند در پے حملوں کے بعد ان چوکیوں پر قبضہ کر لیا اور سرنگا پٹم کی فصیل سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر اپنی بھاری توپیں نصب کر دیں۔

جنرل اسٹورٹ کی کمان میں بمبئی کی افواج سلطان کے چند وفادار افسروں کی مزاحمت کے باعث ابھی تک سرنگا پٹم سے کئی میل دور رکی ہوئی تھیں۔ جنرل ہیرس نے اسٹورٹ کی مدد کے لیے چند دستے مغرب کی طرف روانہ کر دیے۔ سلطان ٹیپو نے ان حالات سے باخبر ہوتے ہی میر قمر الدین کو اسٹورٹ کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کر دیا۔ لیکن بد قسمتی سے میسور کا یہ آزمودہ افسر بھی غداروں کے ساتھ مل چکا تھا۔ چنانچہ اس کی طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر جنرل ہیرس کے دستے بمبئی کے لشکر سے آملے اور یہ لشکر کسی دقت کے بغیر سرنگا پٹم کے قریب پہنچ گیا۔ حملہ آور افواج کو جس کام کے لیے مہینے درکار تھے وہ چند دنوں میں پورا ہو چکا تھا۔

اپریل کے وسط تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کی تمام فوج سرنگا پٹم کے آس پاس جمع ہو چکی تھی لیکن اپنی تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود جنرل ہیرس یہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اڑھائی ہفتوں کے اندر اندر اس جنگ کا فیصلہ نہ ہو سکا تو اس کے

ہزاروں سپاہی فاقہ کشی پر مجبور ہو جائیں گے۔ اسے یہ توقع تھی کہ بمبئی کی فوج اپنے ساتھ کافی رسد لارہی ہے۔ لیکن جنرل اسٹورٹ کی آمد پر اسے یہ پتہ چلا کہ اس کے اپنے سپاہی رسد کی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۸ اپریل کے بعد جنرل ہیرس اپنے سپاہیوں کو نصف راشن پر گزارہ کرنے کا حکم دے چکا تھا اور اس کے اپنے اندازے کے مطابق یہ نصف راشن بھی صرف اٹھارہ دن کے لیے کافی تھا۔

مویشیوں

ئے جرنل ہیرس ۱۸ اپریل کو لارڈ ولزلی کے نام ایک مکتوب میں لکھتا ہے کہ آج صبح چاول کی صحیح مقدار معلوم کی گئی تو یہ پتہ چلا کہ ہم لڑنے والے سپاہیوں کو نصف راشن دے کے بھی صرف اٹھارہ دن اور گزارہ کر سکتے ہیں اگر ۶ مئی تک کرنل ریڈ رسد لے کر نہ پہنچا تو ہمارا ذخیرہ بالکل ختم ہو جائے گا۔

کے لیے چارے کے ذخیرے کی حال اس سے بھی بدتر تھی۔ ان حالات میں آئندہ اڑھائی یا تین ہفتے جنوبی ہندوستان کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن دور کی حیثیت رکھتے تھے۔ موسمِ برسات تک جنگ کی طوالت کی صورت میں کوئی معجزہ ہی انگریزوں کو تباہی سے بچا سکت تھا۔ جنرل ہیرس کے لیے چند دنوں کے اندر اندر سرنگا پٹم پر قبضہ کرنا زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ ابھی تک سرنگا پٹم کی فصیل اور حملہ آور لشکر کے درمیان کئی دفاعی چوکیاں حائل تھیں۔ اور ان چوکیوں پر قبضہ کیے بغیر قلعے پر موثر گولہ باری کرنا ممکن نہ تھا۔ جنرل ہیرس اپنے شدید نقصانات سے بے پرواہ ہو کر چند دن پے در پے ان چوکیوں پر حملے کرتا رہا۔ چنانچہ ۲۶ اپریل تک وہ قلعے کے آس پاس کئی ایسے مقامات پر قبضہ کر چکا تھا جہاں سے اس کی توپوں کے گولے بآسانی فصیل میں شگاف ڈال سکتے تھے۔



چھبیسواں باب

شاہی محل کے اک کونے میں سلطان کے وزرا اور بڑے بڑے سول اور فوجی افسر جمع تھے۔ باہر توپوں کے دھماکوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حاضرین کی نگاہیں برابر ایک کمرے پر لگی ہوئی تھیں اور ان کے چہرے یہ بتا رہے تھے کہ وہ کسی اہم واقعہ کے منتظر ہیں۔ اچانک سلطان ٹیپو فوجی لباس میں نمودار ہوا۔ حاضرین مودکھڑے ہو گئے۔ سلطان نے انہیں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اپنی مسند پر بیٹھ گیا۔ پھر چند ثانیے حاضرین مجلس کی طرف دیکھنے کے بعد سلطان نے کہا۔ میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ بات تھی کہ میور کی جنگ سرنگاپٹم کی چار دیواری کے اندر لڑی جائے۔ میں نے اس جنگ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن جنگ بند کرنے کے لیے دشمن نے جو شرائط پیش کی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ اولاً ہم آدھی سلطنت ان کے حوالہ کردیں اور دو کروڑ روپیہ بطور تاوان ادا کریں۔ ثانیاً میں پانے چار بیٹے اور اپنی فوج کے چار بڑے افسر بطور یرغمال ان کے حوالہ کردوں۔ ہمیں یہ شرائط منظور کرنے کیے چوبیس گھنٹے اور یرغمال پیش کرنے اور تاوان کی نصف رقم ادا کرنے کے لیے اڑتالیس گھنٹے کی مہلت دی گئی ہے۔ میں اپنا فیصلہ دینے سے پہلے تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

اہلِ دربار پر سناٹا چھا گیا۔ میر صادق اپنے دائیں بائیں پورنیا قمر الدین، میر معین الدین اور دوسرے وزراء کی طرف دیکھنے کے بعد اُٹھا اور کہا۔ عالیجاہ! رعایا کے مستقبل کے متعلق سوچنا ایک حکمران کا کام ہے۔ ہم حضور کے خادم ہیں اور حضور کے اشاروں پر جان دینا ہمارا جزوِ ایمان ہے۔

میر صادق یہ کہہ کر بیٹھ گیا اور میر معین الدین نے اُٹھ کر کہا۔ عالی جاہ ان

حالات میں ہمارے لیے دشمن کی شرائط قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔سرنگا پٹم کو تباہی سے بچانے کے لیے!

سُلطان نے اپنی نگاہیں میر معین الدین کے چہرے پر گاڑ دیں اور اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔پچھلی صفوں میں فوج کے نوجوان افسر انتہائی اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔سلطان نے میر معین الدین سے مخاطب ہو کر کہا۔کہیے آپ خاموش کیوں ہو گئے؟

معین الدین نے قدرے جرات سے کام لیتے ہوئے کہا۔عالی جاہ! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہم سے زیادہ عرصہ دشمن کو سرنگا پٹم کی چار دیواری سے باہر نہیں روک سکتے۔میں مانتا ہوں کہ دشمن کی شرائط بہت توہین آمیز ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر ہم نے آج مصالحت کا موقع کھو دیا تو چند دن بعد وہ ہم سے زیادہ کڑی شرائط منوانے کی کوشش کریں گے۔

میر معین الدین بیٹھ گیا اور میسور کی فوج کا جہاندیدہ افسر غازی خاں جس کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں۔اُٹھ کر بولا۔سلطانِ معظم ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے دشمن کی عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی ہے۔انگریز ہمیں بار بار دھوکا نہیں دے سکتے۔یہ ان کی آخری شرائط نہیں بلکہ جنرل ہیرس کا یہ خیال ہے کہ جب حضور کے صاحبزادے اس کے قبضے میں ہوں گے تو ہمیں ان سے بدتر شرائط ماننے پر مجبور کیا جا سکے گا۔اگر میں جنگ کے نتائج کے متعلق بالکل نا اُمید ہوتا تو بھی میرے لیے ایسی شرائط قابلِ قبول نہ ہوتیں لیکن مجھے سرنگا پٹم کے ان چالیس ہزار سرفروشوں کی جُرات اور ہمت پر پورا بھروسہ ہے۔جو آپ کے حکم پر جان دینا اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔مجھے افسوس ہے کہ میر معین الدین نے جنرل ہیرس کی

شرائط قبول کرنے کا مشورہ دے کر ان حُریت پسندوں کے احساسات کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔ پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ دشمن نے اب تک جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کی وجہ یہ نہیں کہ میسور کے سپاہیوں نے کسی میدان میں بزدلی یا بے غیرتی کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری فوج کے بعض رہنماؤں نے مختلف محاذوں پر انتہائی نا اہلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر ہمارے تمام سپہ دار فرض شناسی کا ثبوت دیتے تو آج دشمن کے لشکر کو سرنگا پٹم سے کئی منازل دور ہونا چاہیے تھا۔ میسور کا سپاہی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ دشمن اسے ہر محاذ پر شکست دینے کے بعد یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ اسے صرف یہ شکایت ہے کہ اُسے کئی میدانوں میں اپنے جوہر کھانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس وقت اپنے کسی ساتھی کی سابقہ فروگذاشتوں پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ آج بھی ہم یہاں سے یہ عزم لے کر نکلیں کہ اب ہم سابقہ غلطیوں کا اعادہ نہیں ہونے دیں تو چند دنوں کے اندر اندر دشمن کے تمام منصوبے خاک میں ملائے جا سکتے ہیں۔

غازی خاں کی تقریر کے دوران پچھلی قطار میں بیٹھے ہوئے افسروں کے چہرے پر اُمید کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ جب وہ بیٹھ گیا تو نوجوان افسروں کی آخری قطار سے انور علی اٹھا اور اس نے کہا۔ عالی جاہ! غازی بابا صلح کے لیے دشمن کی شرائط کے متعلق میسور کی تمام حُریت پسندوں کے خیالات کی ترجمانی کر چکے ہیں۔ جن لوگوں کو آپ نے عزت کی زندگی کا راستہ دکھایا ہے ان کے لیے یہ شرائط تلوار کے زخموں سے زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ ابھی ہم زندہ ہیں اور ایسی شرائط کے خلاف تو ہماری قبروں کی مٹی بھی احتجاج کرے گی۔ سید صاحب نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ

اگر ہم نے آج صلح کے لیے دشمن کی شرائط قبول نہ کیں تو چند دن بعد وہ ہم سے زیادہ سخت شرائط منوانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اگر یہ گستاخی نہ ہو تو میں ان کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ ہمیں اپنی موت سے پہلے لحد میں کودنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ آج جب ہمیں اس جگہ حاضر ہونے کا حکم ملا تھا تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ماضی کی کوتاہیوں پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور ہم واپس جا کر مستقبل کے متعلق اپنے سپاہیوں کو مطمئن کر سکیں گے جنہیں یہ شکایت ہے کہ انہیں دشمن کو سرنگا پٹم سے کئی کوس دور روکنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ جنہیں اس قسم کی افواہوں نے پریشان کر دیا ہے کہ ہمارے بعض اکابر نے جان بوجھ کر ملک کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ عالی جاہ! میں کسی پر الزا□ نہیں لگاتا لیکن گزشہ واقعات کے پیشِ نظر، میسور کا ایک ادنیٰ سپاہی بھی یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ دشمن کی پیش قدمی روکنے میں ہمارے بعض اکابر نے جس نا اہلیت کا مظاہرہ کے ا ہے اس کی نظیر میسور کی گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔

میر معین الدین، میر قمر الدین، میر صادق اور پورنیا سراپا احتجاج بن کر سلطان کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن سلطان کے تیور دیکھ کر کسی کو زبان ہلانے کی جرات نہ ہوئی۔ انور علی اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ عالی جاہ! ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم پوری قوت کے ساتھ دشن کا مقابلہ کریں اور اسے یہ ثابت کر دیں کہ اس ملک کے بچے، بوڑھے اور جوان اپنی آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہم لڑے بغیر غلامی کی زندگی پر قناعت کر لیں۔ پہلی صورت میں ہمیں ایک طویل اور صبر آزما جنگ کے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے جان نثار آلام و مصائب کے ہر طوفان سے سرخرو ہو کر نکلیں

گے۔ اگر ہم دوسرا راستہ اختیار کریں تو ہماری حالت ان لوگوں سے مختلف نہیں ہو گی۔ جو موت کے خوف سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ جنرل ہیرس ایک طرف سرنگاپٹم کے گرد اپنا گھیرا مکمل کر رہا ہے اور دوسری طرف صلح کی بات چیت جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیں اس وقت تک خوش فہمی میں مبتلا رکھا جائے جب تک کہ اس کی تلوار ہماری شہ رگ تک نہیں پہنچ جاتی۔

سُلطان ٹیپو نے ہاتھ بلند کیا اور علی خاموش ہو گیا۔ سُلطان نے کہا۔ نوجوان تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں دشمن کی یہ توہین آمیز شرائط تسلیم کرنے پر آمادہ ہو چکا ہوں؟

انور علی نے جواب دیا۔ عالی جاہ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ آپ ایسی توہین آمیز شرائط تسلیم کر سکتے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر ہم میں سے کسی کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی خوش فہی ہے تو دور ہونی چاہیے۔ ہمارے لیے صرف وہ معاہدہ آبرومند ہو گا جو میسور کے سپاہی کی تلوار کی نوک سے لکھا جائے گا اور میں اپنے رہنماؤں اور ساتھیوں کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اس جنگ میں فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں پوری نیک نیتی کے ساتھ اس بات کا عہد کرنا پڑے گا کہ وہ آئندہ ان غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گے جن کے باعث وہ فوج جسے ہم کئی مہینے میسور کی سرحد پر روک سکتے تھے چند دن کے اندر اندر سرنگاپٹم کی چار دیواری تک پہنچ چکی ہے۔ میں جنگ کے نتائج کے متعلق مایوس نہیں ہوں لیکن اب حالات ایسے ہیں کہ ہم کسی غلطی یا کوتاہی کے متحمل نہیں ہو سکتے ہمیں ہر مرحلہ پر ایسے لوگوں سے خبردار رہنا چاہیے جنہیں انگریزوں کی غلامی کا طوق خوشنما زیور دکھائی دیتا ہے۔

انور علی نے تقریر ختم کی اور بیٹھ گیا۔ سلطان ٹیپو نے کہا۔ ہم گزشتہ واقعات سے بے خبر نہیں ہیں اور ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے بعض انتہائی قابل اعتماد افسروں نے ایک شرمناک غفلت اور کوتاہی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر وہ فرض شناسی کا ثبوت دیتے تو دشمن کا لشکر آج سرنگا پٹم سے کوسوں دور ہوتا۔ لیکن اس وقت ہم ماضی کے واقعات پر بحث کرنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتے۔ میں تم میں سے ہر ایک کو اپنی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کا موقعہ دینا چاہتا ہوں۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ مجھے اپنے بیٹوں کا خیال ہے۔ اگر میں یہ شرائط تسلیم کرنے میں اپنی رعایا کا کوئی فائدہ دیکھتا تو انگریز یرغمال کے لیے میرے تمام بیٹوں کا مطالبہ کرتے تو میں تمہارا مشورہ لیے بغیر انہیں انگریزوں کے حوالے کر دیتا۔ لیکن مجھے اپنی رعایا کے ہر بچیا کا مستقبل اپنے بچوں کے مستقبل سے زیادہ عزیز ہے۔ اگر تم سب صدقِ دل سے میرا ساتھ دینا چاہتے ہو اور یہ وعدہ کرتے ہو کہ آئندہ تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی تو میں پورے وثوق کے ساتھ تمہیں یہ خوشخبری دے سکتا ہوں کہ خدا ہمیں اس جنگ میں فتح دے گا۔ میسور میں تمہاری عزت اور آزادی کے پرچم سرنگوں نہیں ہوں گے۔

دشمن کے حالات ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس وقت اس کے سپاہی آدھے راشن پر گزارہ کر رہے ہیں اور چند دن تک وہ بھوکوں مرنا شروع کر دیں گے۔ چارے کی کمی کے باعث ان کے ہزاروں گھوڑے اور بیل روزانہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ چند دنوں تک برسات شروع ہو جائے گی۔ جنرل ہیرس بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہے کہ اگر موسم برسات سے قبل یہ جنگ ختم نہ ہوئی تو اسے ایک عبرتناک تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے تمہیں ہر وقت چوکس رہنا چاہیے جس

دن دریائے کاویری کے پانی کی سطح بلند ہونی شروع ہو گی میں پورے وثوق اور اطمینان کے ساتھ تمہیں خوشخبری سُنا سکوں گا کہ ہم جنگ جیت چکے ہیں۔ برسات کے موسم میں دشمن کی لاتعداد فوج ہمارے رحم و کرم پر ہو گی اور ہم جوابی حملہ کرنے کی بجائے صرف رسد اور کمک کے راستوں کی ناکہ بندی سے دشمن کے پڑاؤ کو ایک وسیع قبرستان میں تبدیل کر دیں گے۔ اس وقت ہمارے سامنے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ہم موسمِ برسات کے آغاز تک دشمن کو سرنگا پٹم کی چار دیواری سے دُور رکھیں اور برسات کے ایام میں دشمن کی حالت اس ہاتھی سے مختلف نہیں ہو گی جو اپنے بھاری ساز و سامان سمیت دلدل میں پھنس کر دم توڑ رہا ہو۔ تم مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا حق رکھتے ہو کہ اگر دشمن نے اپنے شدید نقصانات کے باوجود برسات کے اختتام تک سرنگا پٹم کا محاصرہ جاری رکھا تو ہم کب تک اس کا مقابلہ کر سکیں گے۔ میرا جواب یہ ہے کہ دشمن کو اپنی طاقت سے زیادہ ہماری کمزوری کا احساس نے اس جارحیت کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ اس نے سرنگا پٹم پر اس وقت حملہ کیا ہے جبکہ یورپ اور ہندوستان میں وہ فوری خطرات سے آزاد ہو چکا ہے اور اسے اس بات کا یقین ہے کہ ہمیں باہر سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ لیکن میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ دشمن نے جب حالات سے فائدہ اٹھایا ہے وہ ہر وقت بدل سکتے ہیں۔ زمان شاہ کی واپسی کا یہ مطلب نہیں کہ قدرت نے ہمارا یہ آخری سہارا ہمیشہ کے لیے چھین لیا ہے۔ میں نے جو ایلچی لاہور روانہ کیے تھے انہوں نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ افغانستان کے حکمران کی واپسی چند مجبوریوں کا نتیجہ تھی۔ وہ افغانستان کے حالات درست کرتے ہی واپس آئیں گے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ ہندوستان میں انگریزوں کی جارحیت کا خطرہ ہمیشہ کے لیے دُور

نہیں ہو جاتا۔ میرے ایلچی زمان شاہ کے پیچھے لاہور سے افغانستان روانہ ہو چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر خدا نے چاہا تو وہ ناکام واپس نہیں آئیں گے اور تم عنقریب یہ خوشخبری سنو گے کہ زمان شاہ دوبارہ دلی کا رُخ کر رہا ہے۔ مجھے یہ بھی توقع ہے کہ بحیرہ روم میں فرانس کے جنگی بیڑے کو شکست دے کر انگریزوں نے جو اطمینان حاصل کیا ہے وہ نہایت عارضی ثابت ہو گا اور نپولین بہت جلد یورپ میں ایسے حالات پیدا کر دے گا کہ انگریز وہاں اُلجھ کر رہ جائیں گے اور ہندوستان سے پاؤں سمیٹنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اس جنگ میں مرہٹوں کی غیر جانب داری ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا دوست نہیں سمجھتے۔ میں ابھی تک انہیں اپنا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ تاہم مجھے امید ہے کہ اگر یہ جنگ کچھ عرصہ جاری رہی اور ہم ثابت قدمی سے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے تو مرہٹے اس ملک کو کمپنی کی جارحیت سے نجات دلانے کے لیے ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ انہیں صرف یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ میسور کا سپاہی ہندوستان کے بدترین دشمن کے خلاف آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

میں ہر لحاظ سے اس جنگ کے نتائج کے متعلق پر امید ہوں۔ لیکن اگر میں پُر امید نہ ہوتا تو بھی میں تم سے یہی کہتا کہ ہمارے لیے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس دنیا میں عزت اور آزادی کی زندگی کے تمام دروازے بند ہو جانے کے بعد ہمارے لیے ایک راستہ ہر وقت کھلا رہے گا اور وہ عزت کی موت کا راستہ ہے۔ میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے یہاں جمع کیا تھا کہ تمہارے دشمن کے عزائم کیا ہیں اور اگر تم عزت کی زندگی یا عزت کی موت کے طلبگار ہو تو قدرت تم سے کیا

چاہتی ہے۔اس کے بعد تمہاری کوئی کا تاہی یا بزدلی برداشت نہیں کروں گا۔اب تم جا سکتے ہو۔

اسی رات فوج کے چند افسر قلعے کے ایک کشادہ کمرے میں سرنگاپٹم کے فوجدار سید غفار کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔انور علی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے سید غفار کو سلام کرنے کے بعد کہا۔جناب مجھے معاف کیجیے مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ شمال کی فصیل پر دشمن کی شدید گولہ باری کے باعث میرے دو بہترین افسر زخمی ہو گئے تھے۔ان میں سے ایک نوجوان کی حالت بہت نازک تھی اور مجھے کچھ دیر اس کے پاس ٹھہرنا پڑا۔

سید غفار نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے حاضرین کی طرف دیکھا اور کہا۔غازی خاں ابھی تک نہیں آئے اور ہم زیادہ دیر ان کا انتظار نہیں کر سکتے۔میں نے آپ کو ایک اہم مشورے کے لیے یہاں جمع ہونے کی تکلیف دی ہے لیکن اپنی بات شروع کرنے سے پہلے میں تم سب سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ ہماری کوئی بات اس کمرے سے باہر نہیں جائے گی۔

ایک افسر نے اٹھ کر کہا۔ہم سب حلف اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔

تمہیں حلف اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔مجھے تم پر اعتماد ہے۔میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے ذرا بے احتیاطی کی تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔یہ کہہ کر سید غفار نے کمرے کے دروازے کے سامنے دو پہریداروں کی طرف دیکھا اور انہیں حکم دیا۔تم یہ دروازہ بند کرو اور باہر کھڑے رہو۔اگر غازی بابا تشریف لائیں تو انہیں اندر بھیج دو۔ان کے سوا کسی اور کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں۔

پہریداروں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور سید غفار نے دوبارہ حاضرین کی طرف مُتوجہ ہو کر کہا۔ ہمارے کئی ساتھی اس بات پر سخت مضطرب ہیں کہ سُلطانِ معظم نے ابھی تک ان بڑے بڑے افسروں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جنہوں نے دشمن کا راستہ روکنے میں واضح طور پر غفلت کوتاہی یا بدنیتی کا ثبوت دیا ہے۔

حاضرین مجلس کی نگاہیں اچانک انور علی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور اس نے جلدی سے اُٹھ کر کہا۔ جناب میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُن لوگوں کا ہم خیال ہوں جو سلطنت کے نااہل یا بددیانت افسروں کے خلاف فوری اقدام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور صرف میں ہی نہیں سلطان کا ہر جاں نثار اس صورت حال سے سخت پریشان ہے۔

سید غفار نے قدرے برہم ہو کر کہا۔ انور علی بیٹھ جاؤ تمہیں اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے میں اسی صورتِ حال سے کم پریشان نہیں ہوں۔ لیکن میں ابھی سلطان معظم سے ملاقات کر کے آیا ہوں اور تمہیں یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ ان معاملات کے متعلق ان کی معلومات ہم سے زیادہ ہیں۔ تم نے اپنی تقریر میں صرف ان چند آدمیوں کی طرف مبہم اشارہ کیا تھا جو اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ زہر کہاں تک پھیل چکا ہے۔ اگر چند بڑے آدمیوں کے خلاف فوری کاروائی سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا تو سلطانِ معظم ایک لمحہ کے لیے بھی توقف نہ کرتے، ہمارے محکمہ سراغ رسانی کے افسروں نے سرنگا پٹم کے اندر اور سرنگا پٹم کے باہر غداروں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ طویل ہے اور اس میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی شامل ہیں جو کل تک سلطان کے جاں نثاروں کی صف اول میں شمار کیے جاتے تھے اور جن کی سابقہ خدمات کے پیش نظر

شاید تمہارے لیے بھی یہ یقین کرنا مشکل ہو کہ وہ سُلطان کے ساتھ غداری کر سکتے ہیں۔ سُلطانِ معظم کو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ انہیں ان لوگوں کے عزائم کا اس وقت پتہ چلا ہے جبکہ دشمن کی تلوار ہماری شہ رگ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اگر انہیں دشمن کی پیش قدمی سے قبل ان حالات کا علم ہو جاتا تو ان سے نپٹنا مشکل نہ تھا۔ لیکن موجودہ حالات ہمیں کسی فوری اقدام کی اجازت نہیں دیتے۔ دشمن ایک طرف رسد کیکمی اور دوسری طرف موسمِ برسات کی آمد سے خوف سے آئندہ دس پندرہ دن کے اندر اندر سرنگاپٹم پر فیصلہ کن حملہ کرنے کی کوشش کرے گا اور ان ایام میں ہم کسی اندرونی خلفشار کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ تین ہفتے احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اس کے بعد دشمن کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی ہم اپنے گھر کی صفائی پر توجہ دے سکیں گے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ سرنگاپٹم کے اندر اور باہر تمام غداروں کو بیک وقت گرفتار کر لیا جائے اور کسی کو فتنہ پیدا کرنے یا بھاگنے کا موقع نہ دیا جائے۔ غداروں پر فوراً ہاتھ ڈالنے میں سلطانِ معظم کے تذبذب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے محکمہ جاسوسی نے جن لوگوں کی فہرست پیش کی ہے ان میں اکثر ایسے ہیں جن کے خلاف ابھی تک کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکا۔

انور علی نے کہا۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک قمر الدین، میر معین الدین اور پورنیا جیسے لوگ بھی مجرم ثابت نہیں ہوئے؟

سید غفار نے جواب دیا واقعات کی روشنی میں ان لوگوں پر نا اہلیت یا بُزدلی کا الزم درست ہو سکتا ہے لیکن انہیں غدار ثابت کرنے کے لیے ہمارے جاسوس ابھی تک کوئی قابلِ یقین ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ پورنیا کے متعلق تو میں بھی یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ ایک فوجی مہم کے لیے اس کا انتخاب سراسر غلط تھا اور اس

نے عمداً کوئی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن قمر الدین اور سید صاحب کے متعلق سلطانِ معظم کے خیالات وہی ہیں جو ہمارے ہیں۔ سلطانِ معظم نے مجھے اس بات کی تسلی دی ہے کہ انہیں آئندہ کوئی اہم ذمہ داری نہیں سونپی جائے گی۔ تاہم جب تک وہ فوج میں ہیں میسور کے ہر دیانت دار افسر اور سپاہی کو ان پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے۔ معین الدین اور قمر الدین کے علاوہ کوئی تیس آدمی اور ایسے ہیں جن کے خلاف خفیہ تحقیقات شروع ہو چکی ہے اور جب تک اس تحقیقات کے نتائج ہمارے سامنے نہیں آتے ہمارے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ہم ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔

ایک افسر نے اٹھ کر سوال کیا جناب وہ تیس آدمی کون ہیں؟

اُن کے نام آپ کو غازی بابا سے معلوم ہوں گے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟

اچانک کمرے سے باہر چند آدمیوں کا شور سنائی دیا اور حاضرین دم بخود ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر کوئی بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ فوجدار صاحب مصروف ہیں آپ اندر نہیں جا سکتے۔ پھر کسی نے بارُعب آواز میں جواب دیا۔ فوجدار صاحب سے کہو کہ غازی بابا زخمی ہیں اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔

سید غفار اضطراب کی حالت میں کرسی سے اُٹھا اور اس نے بھاگ کر دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ غازی بابا کہاں ہیں؟ وہ کیسے زخمی ہو گئے؟

جناب وہ ابھی قلعے کے دروازے کے قریب پہنچ کر گر پڑے تھے۔ سپاہیوں نے انہیں اٹھا کر دروازے کے پاس ہی ایک کمرے میں لٹا دیے ہے۔ وہ بے ہوش ہیں اور ان کا لباس خُون سے تر ہے۔ طبیب کہتا ہے کہ زخم بہت خطرناک ہے۔

سید غفار کچھ کہے بغیر سپاہی کے ساتھ چل دیا اور اس کے ساتھی جواب کمرے

سے باہر آ چکے تھے اس کے پیچھے ہو لیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ غازی خاں کے بستر کے قریب کھڑے تھے۔ میسور کا عمر رسیدہ جرنیل نزع کے عالم میں تھا۔ طبیب نے اس کے سینے پر جو پٹی باندھی تھی وہ خون سے تر ہو چکی تھی۔ سید غفار نے جھک کر غازی خاں کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا اور طبیب کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ان کے سینے پر گولی لگی ہے۔ طبیب نے کہا۔

غازی بابا آپ کہاں تھے؟ آپ کیسے زخمی ہوئے؟ سید غفار نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

غازی بابا نے جواب میں اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ میں اس طرف آ رہا تھا۔ راستے میں ملک جہان خاں کا سراغ مل گیا۔ اور میں۔۔۔۔

غازی خاں یہاں تک کہہ کر کھانسنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے خون آ گیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سید غفار نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ غازی بابا ملک جہاں خاں کہاں ہے؟

غازی خاں نے آنکھیں کھولیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی سانس اُکھڑ گئی۔ انور علی انتہائی کرب کی حالت میں آگے بڑھا اور اس نے غازی کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

غازی بابا خدا کے لیے بتائیے آپ کیسے زخمی ہوئے؟ ملک جہاں خاں کہاں ہے؟

غازی خاں کے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی لیکن انور علی ایک مبہم سے آواز کے سوا کچھ نہ سُن سکا۔ چند ثانیے بعد وہ ایک گہری اور لمبی سانس کے ساتھ

اپنا سفرِ حیات ختم کر چکا تھا۔

طبیب باہر جانے لگا تو انور علی نے جلدی سے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ نے جو باتیں اس کمرے میں سنی ہیں وہ اپنے تک محدود رکھیں گے۔ ملک جہان خاں ایک عرصہ سے لاپتہ ہے ممکن ہے کہ غازی خاں کے قاتل تلاش کرنے کے بعد ہمیں ملک جہاں خاں کا سراغ بھی مل جائے، اگر کوئی آپ سے پوچھے تو آپ صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ غازی بابا بیہوشی کی حالت میں وفات پا گئے تھے۔

طبیب نے کہا۔آپ مطمئن رہیں میری طرف سے کوئی بات ظاہر نہیں ہوگی۔

طبیب باہر نکل گیا تو انور علی نے باقی آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اس سلسلہ میں ہم سب کو انتہائی رازداری سے کام لینا پڑے گا۔ غازی بابا کسی خطرناک سازش کے تحت قتل ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے اجتماع میں شرکت کے لیے آرہے تھے اور انہیں نو بجے یہاں پہنچنا تھا۔ ان کی قیام گاہ اور قلعے کے درمیان کوئی دس بارہ منٹ کا راستہ ہے، اس لیے وہ کوئی پونے نو بجے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس سلسلہ میں ہمیں کسی قیاس سے کام لینے کی بھی ضرورت نہیں غازی بابا کی روانگی کا وقت ان کی قیام گاہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہو نو بجے سے قبل روانہ ہوئے ہوں تو ہمارے لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زخمی ہو کر یہاں پہنچنے سے پہلے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کہاں تھے۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ملک جہان خاں کی تلاش میں گئے تھے لیکن ہمارے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں کہ وہ کس طرف گئے تھے اور ملک جہان خاں کے متعلق انہیں کس نے خبر دی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ معمولی تحقیقات کے بعد اس معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔ غازی بابا کوئی غیر معروف

شخصیت نہ تھے۔ انہیں سرنگاپٹم کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ شہر کے بازاروں یا گلیوں میں چلتے وقت انہیں کسی نے ضرور پہچان لیا ہوگا۔ کم از کم رات کے پہریداروں نے انہیں ضرور دیکھا ہوگا۔ غازی بابا کو ملک جہاں خاں کے ساتھ بہت زیادہ اُنس تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے قاتلوں نے انہیں ورغلانے کے لیے جہاں خاں کے متعلق کوئی فرضی کہانی سنائی ہو۔ لیکن اگر ملک جہاں خاں سرنگاپٹم میں موجود ہے تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی جان بھی خطرے میں ہے۔ کیونکہ میسور کے جن دشمنوں نے غازی بابا کو قتل کیا ہے وہ ملک جہاں خاں کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ غازی بابا مرنے سے پہلے ملک جہاں خاں کے متعلق کچھ کہہ گئے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں اس حادثہ کی تحقیقات کے دوران میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

سید غفار نے شفقت سے انور علی کے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ انور! میں تمہیں اس حادثے کی تفتیش کے لیے مکمل اختیارات دیتا ہوں۔



ایک رات منیرہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر مختلف اطراف سے لگاتار توپوں اور بندوقوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ فضا گندھک اور بارود کے دھوئیں سے متعفن ہو چکی تھی۔ خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔ بیگم صاحبہ خان صاحب شاید آج بھی نہ آئیں۔ اب بہت دیر ہو گئی ہے آپ کا کھانا لے آؤں؟

منیرہ نے جواب دیا۔ نہیں مجھے ابھی بھوک نہیں۔ تم جا کر سو جاؤ۔ اگر وہ آ گئے

تو میں خود کھانا لے آؤں گی۔

خادمہ نے کہا۔ بی بی جی آج دشمن نے سارا دن دم نہیں لیا۔ ان کی توپیں صبح سے آگ برسا رہی ہیں۔ منور کہتا تھا کہ ابھی چند گولے ہمارے پڑوس میں گرے تھے اور ہمارے پاس ہی ایک مکان کی چھت میں شگاف پیدا ہو گئے ہیں۔

منیرہ نے جواب دیا۔ منور نے سب سے پہلے یہ خبر مجھے سنائی تھی اور پڑوس کے مکان کی چھت پر جو گولہ گرا تھا میں نے اس کا دھماکہ سنا تھا۔

خادمہ نے کہا۔ بی بی جی آپ چند نوالے کھا لیتیں تو بہتر ہوتا۔

میں کھا لوں گی تم جاؤ

خادمہ کمرے سے باہر نکل گئی اور منیرہ کرسی سے اُٹھ کر دریچے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بستر پر لیٹ گئی۔ آدھی رات بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدلنے کے بعد اس پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ لیکن اچانک سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور اس کا سینہ مسرت کے دھڑکنوں سے لبریز ہو۔ انور علی کمرے میں داخل ہوا اور وہ بے اختیار آگے بڑھ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ انور علی نے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تھکی آواز میں کہا۔ منیرہ تم ابھی تک جاگ رہی ہو!

منیرہ نے گردن اٹھا کر اس کیطرف دیکھا۔۔۔ مسکرائی۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک پڑے۔

اس نے کہا تشریف رکھیں میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔

انور علی نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں کھانا کھا چکا ہوں اس وقت مجھے

تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔

آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔منیرہ نے کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں تھک گیا ہوں منیرہ۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔اگر ہم تمام افسروں پر یکساں اعتماد کر سکتے تو جنگ بہت آسان تھی۔لیکن ہمیں ہر وقت یہ خدشہ رہتا ہے کہ بعض لوگ ہمیں کسی وقت بھی دھوکہ دے سکتے ہیں مجھے گزشتہ تین راتوں میں زیادہ سے زیادہ چھ یا سات گھنٹے سونے کا موقع ملا ہے۔آج میں تھکاوٹ اور نیند سے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا اور سید غفار نے مجھے صبح تک گھر میں آرام کرنے کا حکم دیا ہے۔

منیرہ نے کہا۔مجھے یقین نہیں آتا کہ میسور کا کوئی سپاہی سلطان کے ساتھ غداری کر سکتا ہے۔منیرہ ہمیں میسور کے عام سپاہیوں سے کوئی خطرہ نہیں۔وہ مرتے دم تک سلطان کے وفادار رہیں گے۔ہمیں صرف اُونچے طبقے کے ان مفاد پرست لوگوں سے خطرہ ہے جو تاریک گزرگاہوں میں قوم کا ساتھ نہیں دیا کرتے۔

منیرہ نے سوال کیا۔ایسے نا قابلِ اعتماد لوگوں کو فوج سے علیحدہ کیوں نہیں کیا گیا؟

انور علی نے جواب دیا۔منیرہ بعض اوقات ایک غلط وقت پر ایک صحیح اقدام بھی خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرتا۔ہمارے تاریخ کے یہ چند دن ایسے ہیں کہ ہم کسی اندرونی انتشار کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر خُدا کا فضل شامل حال رہا تو دو ہفتوں کے اندر اندر جنگ کے حالات ہمارے لیے موافق ہو جائیں گے اور ہم اپنے اندرونی حالات پر پوری توجہ دے سکیں گے۔ابھی تک ہمیں

یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ دشمن کے ساتھ سازباز کرنے والے غداروں کی صحیح تعداد کیا ہے۔ تاہم تمہارے اطمینان کے لیے میں یہ بتا سکتا ہوں کہ جن لوگوں کی وفاداری مشکوک ہے انہیں جنگ کے دوران میں کوئی اہم ذمہ داری نہیں سونپی جائے گی۔ پھر جب مُناسب وقت آئیگا تو ہم ایک ساتھ دو اہم خبریں سنو گی۔ ایک یہ کہ ہم نے دشمن کو پسپائی پر مجبور کر دیا ہے اور دوسری یہ کہ ہم نے سرنگا پٹم کے اندر اور سرنگا پٹم سے باہر دوسرے شہروں اور قلعوں میں سلطان کے خلاف ایک خطرناک سازش میں حصہ لینے والے تمام مجرموں کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو غدار ابھی تک ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر سلطان کا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کریں اور ہم فوج کے اندر بے چینی اور بد دلی کا خطرہ مول لیے بغیر اس سازش کے سرغنوں سے نجات حاصل کر لیں۔

منیرہ نے چند ثانیے کے بعد پوچھا۔ آپ کو یہ یقین ہے کہ چند دنوں تک جنگ کا پانسہ پلٹ جائے گا۔

ہاں منیرہ مجھے یقین ہے۔ وہ سپاہی جنہیں سُلطان ٹیپو جیسا رہنما ملا ہو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتے۔ انور علی نے یہ کہہ کر اپنے جوتے اتارے اور ایک جمائی لے کر بستر پر لیٹ گیا۔ منیرہ نے ذرا آگے جھک کر کہا۔ غازی خاں کے قاتلوں کا سُراغ ملا؟

نہیں ابھی تک ہمیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس مرد مجاہد کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔

منیرہ نے کہا۔ میں ابھی آپ کے آنے سے پہلے یہ سوچ رہی تھی کہ اس وقت مراد کہاں ہو گا۔ لاہور سے افغانستان کا رُخ کرنے کے بعد اس نے کوئی اطلاع

نہیں بھیجی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر زمان شاہ کے ساتھ اس کی ملاقات ہوگئی تو بہت جلد واپس پہنچ جائے گا۔ انور علی نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کرلیں اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔



غروبِ آفتاب سے کچھ دیر قبل اپنے شاندار محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایک نوکر نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ حضور سید صاحب تشریف لاتے ہیں۔

قمر الدین جلدی سے باہر نکلا تو میر معین الدین برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ قمر الدین نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے بہت دیر لگائی میں سخت پریشان تھا۔ ابھی تک ہمارے باقی دوستوں سے بھی کوئی نہیں پہنچا۔

میر معین الدین نے کہا۔ انہیں میر صادق نے یہاں آنے سے منع کردیا ہے۔

میر قمر الدین پریشانی اور اضطراب کی حالت میں میر معین الدین کی طرف دیکھنے لگا اور معین الدین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میر صاحب پریشانی کی کوئی بات نہیں موجودہ حالات میں ہمارا ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنا ضروری ہے۔ ابھی میر صادق کا ایک آدمی میرے پاس یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ حکومت کے جاسوس خاص طور پر میرا اور آپ کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے باقی ساتھیوں کو ہم سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ میرا اور آپ کا معاملہ میر صادق، بدر الزمان خان اور میر غلام علی سے مختلف ہے۔ بدر الزمان کے متعلق تو سلطان یہ سننے

کے لیے بھی تیار نہیں ہوگا کہ وہ کوئی بد عہدی کرسکتا ہے۔پورنیا فوجی معاملات میں اپنی نااہلیت اور بے سمجھی کا اعتراف کرنیکے بعد کافی حد تک سلطان کے شبہات دور کر چکا ہے۔لیکن جوافسر براہِ راست ہمارے ماتحت تھے ان پر کڑی نگرانی رکھی جارہی ہے،اگرہمیں ابھی تک گرفتار نہیں کیا گیا تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطان کے دربار میں بدرالزماں خاں کا اثر ورسوخ کم نہیں ہوااوران کا یہ مشورہ مان لیا گیا ہے کہ حالات کی پوری چھان بین سے قبل اس سلسلہ میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔

قمرالدین مسکرایا۔سید صاحب ہمارے فوراً گرفتار نہ کیے جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میر صادق کی کوششوں سے غداروں کی فہرست میں کئی ایسے آدمیوں کے نام بھی شامل کردیے گئے ہیں جنہیں میسور کے سپاہی شک وشبہ سے بالاتر سمجھتے ہیں۔آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ محکمہ جاسوسی کا ایک بڑا افسر میر صادق کے ہاتھ میں ہے۔

وہ کون ہے؟

یہ مجھے معلوم نہیں۔میر صادق ہمیں تمام باتیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔اس کے اپنے جاسوس ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔اسے سرنگا پٹم کے اندر اور سرنگا پٹم سے باہر ہمارے تمام ساتھیوں کا علم ہے لیکن ہمیں اس کے بیشتر ساتھیوں کے متعلق کوئی علم نہیں۔اسے یہ معلوم ہے کہ انگریز کس دن اور کس وقت سرنگا پٹم پر فیصلہ کُن حملہ کریں گے۔فصیل کے کون سے حصے میں شگاف ڈالا جائے گا اور جنرل ہیرس کا راستہ صاف کرنیکے لیے کون سے اقدامات کیے جائیں گے۔

میر معین الدین نے کہا۔مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کہیں ہم نے اتنے

ہوشیار آدمی کو اپنا ساتھی سمجھنے میں غلطی نہ کی ہو۔ اگر جنگ کے حالات بدل گئے تو ایسے ہوشیار آدمی سے یہ بات غیر متوقع نہیں کہ وہ دشمن کی کامیابی سے مایوس ہو کر اپنا مفاد سلطان کے ساتھ وابستہ کر دے، اگر وہ سلطان کے ساتھ غداری کر سکتا ہے تو ہمیں بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ ہمارے خلاف اس کے پاس اتنا مواد ہے کہ وہ جب چاہے ہماری گردن پھانسی کا پھندا ڈال سکتا ہے لیکن ہم اس پر کوئی جُرم ثابت نہیں کر سکیں گے۔

قمر الدین نے جواب دیا۔ سید صاحب جب تک ملک جہاں خاں سرنگا پٹم کے قید خانے میں موجود ہے ہمیں میر صادق سے کوئی خطرہ نہیں۔ اس نے پورنیا کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ملک جہاں خاں کے قتل کی مخالفت کی تھی۔ اب ہماری کوشش یہ ہوگی کہ جب تک ہمارے خدشات دور نہیں ہوتے ملک جہاں خاں کا بال بھی بیکا نہ ہو اور میں نے اس بات کا پورا انتظام کر لیا ہے۔ قید خانے کا داروغہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک ایسی تحریر ہے جو آخری وقت تک میر صادق کی شہ رگ پر خنجر کا کام دیتی رہے گی۔

میر معین الدین دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور قمر الدین نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ میرے پاس سلطان کے نام ملک جہاں خاں کی ایک درخواست ہے جس میں اس نے اپنی گرفتاری کے تمام واقعات بیان کیے ہیں۔

یہ درخواست آپ کے پاس کیسے پہنچی؟

میر قمر الدین نے جواب دیا۔ میں نے قید خانے کے داروغہ کو مشورہ دیا تھا اور اس نے ملک جہان خاں سے یہ درخواست لکھوا کر میرے حوالے کر دی تھی۔ اب صورت یہ ہے کہ قید خانے کا داروغہ میر صادق اور میں ایک دوسرے کو دھوکا نہیں

دے سکتے۔ احتیاط کے طور پر اس درخواست کے متعلق پورنیا اور میر صادق کو بھی بتا چکا ہوں۔ ہمارے لیے اپنے تمام ساتھیوں کو اس بات کا یقین دلانا ضروری تھا کہ پھانسی کا پھندا ہم سب کے لیے یکساں تکلیف دہ ہوگا۔

معین الدین نے کہا۔ میر صاحب غازی خاں کا قتل میرے لیے ابھی تک ایک مُعما ہے۔ لیکن میرے لیے یہ معما نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے میر صادق کے آدمیوں نے قتل کیا ہے اور اسے قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جس قدر ذہین اور تجربہ کار تھا اسی قدر ہمارے لیے خطرناک تھا۔

آپ نے میر صادق سے اس کے متعلق پوچھا ہے؟

نہیں۔ لیکن غازی خاں کے قتل سے پہلے میر صادق نے ایک دن میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں ان سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے آدمی غازی خاں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟

ستائیسواں باب

مئی ۱۷۹۹ کے آغاز کے ساتھ سرنگا پٹم پر دشمن کی گولہ باری انتہائی شدت اختیار کر چکی تھی۔ میسور کے غدار دفاعی استحکامات کے متعلق دشمن کو تمام ضروری معلومات فراہم کر چکے تھے اور شہر پناہ کے کمزور حصوں پر دشمن کی گولہ باری نسبتاً زیادہ شدید تھی۔ انگریز آہستہ آہستہ اپنی قلعہ شکن توپیں آگے لا رہے تھے اور ان کے پیادہ دستے حملے کے لیے فصیل کے اردگرد خندقیں کھود رہے تھے قلعے کے بیرونی فصیل نے موروچوں سے دشمن پر اہل سرنگا پٹم کی گولہ باری کافی موثر ثابت ہو سکتی تھی اور انہیں بآسانی پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا۔ لیکن جو افسر غدارانِ قوم کے ساتھ مل چکے تھے وہ صرف نمائشی کارگزاری پر اکتفا کر رہے تھے۔ دشمن کو صرف ان مورچوں سے شدید مزاحمت کا سامن کرنا پڑ رہا تھا جہاں سلطان کے وفادار افسر موجود تھے۔

اس طوفان میں عام سپاہیوں کے حوصلے قائم رکھنا سلطان کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر جگہ جگہ دفاعی استحکامات کا معائنہ کرتا وا سے اپنی تھکاوٹ بھوک اور پیاس کا احساس نہ تھا۔ لیکن غدار اپنا کام کر چکے تھے۔ وہ سلطان کو دیکھتے ہی دشمن پر گولہ باری شروع کر دیتے اور جب سلطان کی توجہ کسی دوسرے محاذ پر مبذول ہوتی تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے۔ سلطان کے وفادار افسر بھی اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دن رات مصرور رہتے تھے۔ لیکن ان کی ہمت اور ان کا ایثار و خلوص دشمنانِ وطن کے ارادوں کا توڑ ثابت نہ ہو سکا۔ جو افسر میر صادق اور دوسرے غداروں کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے وہ نمائشی گولہ باری کے وقت بھی اس بات کی تسلی کر لیتے تھے کہ دشمن کی ان کی توپوں اور بندوقوں کی زد سے باہر ہے۔

۴ مئی کے دن فصیل میں چند شگاف پیدا ہو چکے تھے اور شہر میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ سلطان آدھی رات تک مختلف موروچوں پر گشت کرتا رہا۔ تیسرے پہر اس نے محل میں جانے کی بجائے شمالی دیوار کے ساتھ ہی ایک خیمے میں کچھ دیر آرام کیا۔ صبح کے وقت وہ نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو خیمے کے دروازے کے سامنے فوج کے چند افسر اور چند ہندو سادھو اور جوتشی کھڑے تھے، ایک افسر نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کاہ۔ عالیجاہ! رات کے وقت دشمن کی مسلسل گولہ باری کے باعث شہر پناہ کے جنوب مغربی کونے میں ایک وسیع شگاف پڑ چکا ہے۔

سلطان نے کسی توقف کے بغیر اپنا گھوڑا لانے کا حکم دیا لیکن سرنگا پٹم کے مشہور جوتشی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ ان داتا آج کا دن آپ کے لیے بہت منحوس ہے۔ اس لیے آپ کو اپنے محل میں قیام کرنا چاہیے۔

سلطان مسکرایا۔ اگر تم مجھے موت سے ڈرانا چاہتے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی۔

نہیں نہیں ان داتا آج آپ باہر نہ نکلیں۔

سلطان نے کہا اس دنیا میں ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے اور میں اپنی تقدیر سے بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔

جوتشی نے کہا۔ ان داتا بھگوان آپ کو رہتی دُنیا تک سلامت رکھے لیکن آج آپ دان ضرور کریں۔

سلطان نے پاس ہی ایک سپاہی کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور رکاب پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ سونے اور چاندی کے دان کے لیے محل کے داروغہ کو میرا حکم پہنچ چکا ہے لیکن ایک حکمران کا سب سے بڑا دان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی عزت اور آزادی کے لیے اپنے خون کے چند قطرے پیش کر دے۔